مغربی فلسفۂ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ

پروفیسر سید محمد سلیم

ادارہ تعلیمی تحقیق ۰ تنظیم اساتذہ پاکستان
۸۔ اے۔ ذیلدار پارک ۰ اچھرہ — لاہور

نام کتاب ـــــــ مغربی فلسفۂ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ
مصنف ـــــــ پروفیسر سید محمد سلیم
اشاعت اوّل ـــــــ اکتوبر ۱۹۸۱ء
اشاعت دوئم ـــــــ ستمبر ۱۹۸۶ء
اشاعت سوم ـــــــ اکتوبر ۱۹۸۹ء
تعداد ـــــــ ایک ہزار
قیمت ـــــــ ۵۶ روپے

مہر محمد سعید اختر نے شرکت پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر ادارہ تعلیمی تحقیق ، تنظیم اساتذہ پاکستان ۸-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

کے لیے معین و مددگار ثابت ہو جائے۔ شاید یہ حقیر سی محنت حضور بارگاہِ خداوندی شرفِ قبولیت حاصل کرلے۔

مبیضہ ۱۹۷۸ء میں تیار ہو گیا تھا، مگر واۓ افسوس وہ گم ہو گیا۔ اس لیے دوبارہ مبیضہ تیار کرنا پڑا۔ اس وقت یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ دوبارہ مبیضہ تیار کرنا تحریر اور تسوید کے مرحلے سے بھی دشوار تر ہوتا ہے۔ اس مبیضہ کو تیار کرنے میں رفیق محترم جناب پروفیسر عبدالحبیب احسن نقشبندی نے جس خلوص اور محنت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا ذکر کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں۔ اگر ان کی مخلصانہ رفاقت حاصل نہ ہوتی تو شاید بعض مراحل طے نہ ہو پاتے (بدمد)

۲۷۔ ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ　　　　محمد سلیم

۸۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء　　　　گورنمنٹ کالج۔ شکارپور۔ سندھ

پہلا باب

یورپ کا کلیسائی معاشرہ

۵۰۰ء ——— ۱۴۰۰ء

تعلیم اور معاشرہ

تعلیم ایک معاشرتی اور مقصدی عمل ہے۔ تعلیم کے ذریعہ نوخیز نسلوں کو معاشرہ کے مقبولِ عام افکار اور پسندیدہ اطوار سکھائے جاتے ہیں۔ ماہرین اور اساتذہ کے ذہنوں میں مقبول ترین افکار اور پسندیدہ ترین طرزِ عمل کا واضح تصور پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ ان افکار اور اعمال کی مقبولیت اور پسندیدگی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو خیال اور فکر کسی استاد کو پسند آگیا، اس نے اس کی تعلیم دینی شروع کر دی۔ یہاں مجھی پسند اور ناپسند کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہاں ان افکار اور اعمال سے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جو معاشرہ کی اکثریت کے نزدیک مقبول ہوتے ہیں۔ ان کو ماہرینِ تعلیم اور اساتذہ طلبہ کی تعلیم کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ یہی وہ مقاصد ہیں جو اساتذہ کے لیکچروں میں اور طلبہ کی درسی کتابوں میں جاری اور ساری نظر آتے ہیں۔ ان کو "تعلیمی اقدار" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نظامِ تعلیم کا مقصد تعلیمی اقدار کو نوخیز نسلوں کے دل و دماغ میں جاگزیں کرنا ہوتا ہے۔ ہر نظامِ تعلیم چند تعلیمی اقدار کو فروغ دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا نظامِ تعلیم نہیں پایا جاتا جو تعلیمی اقدار سے یکسر خالی ہو، جس کے پیش نظر سرے سے کوئی مقصد ہی نہ ہو۔

مزید غور و خوض سے کام لیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ماہرینِ تعلیم اور اساتذہ کسی نہ کسی معاشرہ سے وابستہ افراد ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں رائج تصوّرات سے ان کی ذہنی تشکیل ہوتی ہے۔ خیر و شر، حُسن و قبح، صحیح و غلط، جائز و ناجائز، پسند و ناپسند کے جو پیمانے معاشرہ میں مشہور و معروف ہوتے ہیں، وہی معیارات ان کے نزدیک بھی مقبول ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر میں معاشرتی معیار صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہی وہ افراد ہیں جو تعلیمی اقدار وضع کرتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان اقدار میں معاشرہ میں مروجہ افکار و نظریات عکس ریز ہوتے ہیں۔ گویا تعلیمی اقدار کا منطقی ربط معاشرہ کے تصوّرات اور نظریات سے قائم رہتا ہے۔ جس قسم کے معاشرتی افکار و نظریات ہوں گے، اسی نوع کی تعلیمی اقدار پروان چڑھیں گی۔

اگر مزید دقتِ نظر سے کام لیا جائے اور تحقیق و تدقیق کا قدم اور آگے بڑھایا جائے تو یہ حقیقت مبرہن ہو کر سامنے نظر آتی ہے کہ معاشرہ ریت کے ذرّوں یا گندم کے دانوں کی طرح انسانوں کی کوئی بھیڑ یا مجمع نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک جسمِ نامی Organism کی طرح ہوتا ہے، جس کے افراد وحدتِ فکر و عمل سے سرشار ہوتے ہیں۔ اِس عُضویہ میں ایک مرکزی تصوّر بمنزلہ رُوح کے جاری و ساری رہتا ہے۔ مرکزی تصوّر کے اس سرچشمہ سے تمام اعضا اور جوارح غذا اور بالیدگی حاصل کرتے ہیں۔

مرکزی تصوّر چند بنیادی حقیقتوں سے متعلق افکار و تصوّرات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان اور کائنات، خدا اور آخرت انسانی زندگی کی مہتم بالشان حقیقتیں ہیں۔ ان کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کوئی نہ کوئی رائے یا عقیدہ قائم کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ صفحۂ ارضی پر آج تک جس قدر انسانی معاشرے وجود میں آئے ہیں، وہ سب اسی قسم کی تخیل آرائی کی بنا پر قائم ہوئے ہیں۔ قدیم غیر متمدن دَور کا سردار یا کاہن ہو یا جدید علمی روشنی کے فلاسفہ یا سائنس داں ان

ہوں، سب کو ان بنیادی حقیقتوں کے متعلق کچھ نظریات قائم کرنے پڑتے ہیں بتدریج ان نظریات پر پختہ یقین پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ معاشرہ میں قبولیتِ عامہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان بنیادی نظریات سے معاشرہ میں اِستحکام پیدا ہوتا ہے یہ نظریات دیو مالا کے قصّے ہو سکتے ہیں۔ فلاسفہ اور حکماء کے افکار و نظریات ہو سکتے ہیں اور رُوحانی بزرگوں کے غیب کے عقائد۔ بہرکیف بنیادی حقیقتوں سے متعلق افکار و نظریات کا مجموعہ معاشرہ کا مرکزی تصوّر ہوتا ہے —— Idealogy —— یہ معاشرہ کی اکائی میں بمنزلہ رُوح کے کام کرتا ہے۔ جتنی زیادہ اس تصوّر میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی وہ معاشرہ فروغ پاتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ اِس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمی اقدار کا گہرا ربط معاشرے کے مرکزی تصوّر سے ہوتا ہے۔ اس سے غذا حاصل کر کے وہ معاشرہ فروغ پاتا ہے۔ مرکزی تصوّرِ حیات سے صرفِ نظر کر کے نہ تو معاشرتی افکار و نظریات کی حقیقت سمجھ میں آ سکتی ہے اور نہ تعلیمی اقدار کی قدر و قیمت متعین کی جا سکتی ہے۔ یہ سب ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں۔

اِس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظامِ تعلیم کوئی ایسی شے نہیں ہے جو اچانک آسمان سے نازل ہوتی ہے، نہ وہ ہوا میں اور خلا میں تشکیل پاتا ہے، نہ کوئی ایسی مشین ہے جس کو ہر جگہ اور ہر مقام پر فٹ کیا جا سکتا ہے۔ نظامِ تعلیم کی گہری جڑیں ہوتی ہیں۔ وہ معاشرہ کے بنیادی افکار میں پیوست ہوتی ہیں۔ کسی معاشرہ میں صرف وہی نظامِ تعلیم پروان چڑھ سکتا ہے اور فروغ پا سکتا ہے جو معاشرہ کی اجتماعی ذہنیت سے کامل سازگاری رکھتا ہو۔ اگر یہ ہم آہنگی مفقود ہو تو پھر نظامِ تعلیم کے نتیجے میں اس معاشرہ کے اندر تضاد اور اِنتشار رُونما ہو جائے گا۔ جس کے بعد اس معاشرہ کا ایک ایک فرد انتشارِ ذہنی اور عملی بدراہی کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب

ذہنی یک سُوئی مفقود ہو تو عملی قویٰ مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس صورت میں نظامِ تعلیم معاشرہ میں تقویت کا مُوجب بننے کے بجائے اضمحلال اور انتشار کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

یہ دائمی اور ابدی حقائق ہیں۔ انسانی معاشروں کے عروج و زوال میں یہ ابدی حقیقتیں مؤثر کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ کسی معاشرہ کو سمجھنا ہے تو ان حقائق کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ ان حقائق کی روشنی میں مغربی نظامِ تعلیم کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جا سکتی ہے۔ اِس لیے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ اس مرکزی تصوّرِ حیات کی وضاحت کی جائے جس پر اہلِ مغرب نے جدید معاشرہ تعمیر کیا ہے۔ پھر ان افکار و نظریات کا تذکرہ کیا جائے جو معاشرہ میں قبولیت عامہ حاصل کر چکے ہیں۔ آخر میں مغربی نظامِ تعلیم کی اقدار کا جائزہ لیا جائے جو معاشرہ میں مروج نظریات و تصورات سے ماخوذ اور مستنبط ہیں۔ اس کتاب میں تمام مباحث اسی ترتیب سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

کلیسائی معاشرہ

قرونِ وسطیٰ میں یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ علم کی روشنی وہاں سے غائب تھی۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اہلِ کلیسا کا وجود ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مانند تھا۔ پالوسی مسیحیت Pauline Christianity جو یورپ پر غالب تھی۔ اس کے عقائد عقل اور فہم کی گرفت سے بالا تھے۔ اِس لیے اہلِ کلیسا کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ عوام الناس جاہل رہیں۔ فہم و ادراک کی قوتیں ان کے اندر اُبھرنے نہ پائیں، تاکہ کوئی شخص کلیسائی عقائد پر اعتراض نہ کر سکے۔ اِس لیے کلیسائی غلبہ کے دَور میں علمی اور فکری سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی۔ کلیسائی درس گاہوں میں

مسیحی عقائد کی تعلیم اور عبادات کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ آزادانہ غور و فکر کا دروازہ مسدود تھا۔

کلیسا نے چند خُود ساختہ مزعومات کی بنیاد پر جو معاشرہ یورپ میں قائم کیا تھا، وہ حد درجہ ناقص تھا، یک رُخا تھا اور انسان کے طبعی تقاضوں کے بالکل خلاف تھا۔ مثلاً اس میں دینداری کا اعلیٰ معیار یہ مقرر کیا گیا تھا کہ مرد عورت سے ازدواجی تعلقات قائم نہ کرے۔ مزید ترقی ہوئی اور پھر یہ معیار مقرر ہوا کہ کسی بھی عورت کے قریب نہ پھٹکے۔ غضب یہ کیا کہ شفقت و محبت سے بھری ہوئی ماں کے سائے سے بھی منع کر دیا گیا۔ لیکی Lecky, 1838-1932 نے "تاریخ اخلاق یورپ" میں ایک عبرت انگیز واقعہ لکھا ہے۔ ایک ماں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے خانقاہ کے دروازے پر پہنچی تاکہ اپنے لختِ جگر کو ایک نظر دیکھ لے۔ بیٹے یعنی راہب کو جب ماں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ وہاں سے دُور بھاگ گیا۔ ماں بے چاری روتی اور تڑپتی رہ گئی۔ فطرتِ انسانی کے انحراف کی اس سے زیادہ سنگین اور دردناک مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ رہبانیت نے انسانوں کی فِطرت کو مسخ کر دیا تھا۔ ان کے جذباتِ لطیف کو کچل ڈالا تھا۔[1]

کلیسائی نظام بلا شرکتِ غیرے حاکم اور غالب تھا۔ دینی اور دنیوی معاملات میں اہلِ کلیسا کا فیصلہ حکمِ ناطق اور حرفِ آخر کا درجہ رکھتا تھا۔ تمام بادشاہ اور شہنشاہ اس کے آگے سرِ اطاعت خم کرتے تھے۔ اوقاف اور عطیات کی شکل میں سرزمینِ یورپ کا تقریباً پانچواں حصّہ اہلِ کلیسا کے قبضے میں تھا۔ کلیسا محاصل کی ادائیگی سے بالکل آزاد تھا۔ اس کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ پادریوں کی دولت بڑے بڑے تاجروں کو شرماتی تھی۔ گرجوں کی سر بفلک عمارات اور پھر ان کی زرق برق آرائش و زیبائش قصرِ شاہی

---

[1] تفہیم القرآن ج ۵ ص ۳۳۰

کا مذاق اُڑاتی تھیں۔

جہالت اور طاقت کے نشے نے تنگ نظری اور تعصب پیدا کر دیا تھا۔ اہلِ کلیسا نے مذہبی تعصب کو ہوا دے کر یورپ کے اندر دو سو سال تک (۱۰۹۵ تا ۱۲۹۱ء) صلیبی جنگوں کی آگ کو بھڑکائے رکھا تھا۔ لاکھوں انسانوں کو یورپ سے کھینچ کر لاتے تھے اور عالمِ اسلام پر حملہ کراتے تھے۔ صلیبی مجاہدین مسیح مقدس کے نام پر فلسطین کے مسلمانوں کا قتلِ عام اس سنگ دلی اور سفاکی سے کرتے تھے کہ قدیم زمانہ کے رومی تیغ آزما Gladiators بھی ان کے سامنے مات تھے۔ خون آشامی ان کا دل پسند مشغلہ بن گیا تھا۔ جہالت اور توہم پرستی کا ایک کرشمہ اہلِ کلیسا کی وہ مہم تھی جو اس نے "جادوگرنیوں" کے خلاف سارے یورپ میں جاری کی تھی۔ ہزاروں بڑھیا کھوسٹ عورتوں کو جادوگرنی قرار دے کر اذیت ناک طریقوں سے ہلاک کر دیا گیا۔[1]

۱۴۹۸ء میں اندلس پر غلبہ پانے کے بعد مفتوح عربوں کو عیسائی بنانے کی مہم جاری کی گئی۔ نئے عیسائیوں اور گمراہ فرقوں کے عقائد اور اعمال کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے احتسابی عدالتیں Inquisition Courts 1231-1820 قائم کی گئیں۔ یہ نام نہاد عدالتیں ظلم و ستم کا بدترین آلہ تھیں۔ سُراغ رسانوں اور ستم رانوں کے غول کے غول کلیسا کی پُشت پناہی میں عوام الناس کے عقائد کی ٹوہ لیتے پھرتے تھے۔ جو کوئی ان کے ہتھے چڑھ گیا، پھر شکنجۂ عذاب

---

[1] اس مہم کی ہلاکت خیزی کا اندازہ درج ذیل اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے:
جادوگرنیوں کو ختم کرنے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تعداد کو نذرِ آتش کیا گیا۔
ٹولوز میں ۴۰۰، جنیوا میں ۵۰۰، ہیمبرگ میں ۶۰۰، واٹزبرگ میں ۹۰۰، ٹریو ز میں ۷۰۰۰ مردوں اور عورتوں کو فنا کیا گیا۔

(ماخوذ از یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ از ہیمرٹن شا)

سے نہ بچ سکا۔ ایذا دہی کے نئے نئے طریقے اختراع کرنے میں ان کا ذہن خوب چلتا تھا۔ مظلوموں کے ننگے جسموں پر کوڑوں کی بارش ہوتی تھی، زندہ انسانوں کو مُردہ کتوں کی طرح گھسیٹا جاتا تھا، مُنہ کے اندر کھولتا ہُوا پانی اُنڈیل دیا جاتا تھا، ہاتھوں پر دہکتے ہُوئے انگارے رکھ دیے جاتے تھے، کانوں میں بارود بھر کر فلیتہ دکھا دیا جاتا تھا، زندہ انسانوں کو آگ کے الاؤ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ اِس طرح نت نئے طریقوں سے بے گناہوں کو عذاب دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔

تحریکِ اصلاحِ دین Reformation Movement of 1517 کے زمانہ میں ایک فرقے کے نزدیک دُوسرے فرقے کے لوگوں کا خُون بہانا مباح ہو گیا تھا۔ سینٹ بارتھولومیو St. Bartholomeo کے مقدس دن پر ۲۴ راگست ۱۵۷۲ء — کیتھولک فرقے والوں نے پروٹسٹنٹ فرقے کے اسّی ہزار افراد کو نہایت سنگ دلی کے ساتھ ذبح کر ڈالا تھا۔ ہلاکت، غارت گری، نفرت اور تعصب کے ایسے بھیانک اور رُوح فرسا مناظر اس دَور میں عام تھے۔

یہ مناظر دیکھ کر عام لوگ اہلِ کلیسا کی سنگ دلی اور بالا دستی سے متنفر اور نالاں تھے۔ ایک واقعہ سے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ حکمران طبقہ اور اشراف کا طبقہ Nobles بھی اہلِ کلیسا کے غلبہ اور طرزِ عمل سے نالاں اور بیزار تھا۔ صلیبی جنگوں کے دوران شہنشاہ روما فریڈرک دوم Fredric II, 1212-1250 نے سُلطان مصر محمد الکامل (۱۲۱۸ء۔۱۱۹۹ء) سے ایک مُلاقات کے دوران کہا تھا۔ "سُلطان کتنا خُوش قسمت ہے کہ اس کا کوئی پوپ نہیں ہے۔"[1]

---

[1] "تشکیلِ یورپ" از بریفالٹ بحوالہ "یورپ پر مسلمانوں کے احسانات" از ڈاکٹر غلام جیلانی برق صفحہ ۲۹

اِسلامی اثرات کا نفوذ

صلیبی جنگوں (۱۲۹۱ء - ۱۰۹۵ء) کا ایک خوش آئند نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے لاکھوں افراد نے شام اور فلسطین جا کر برتر اسلامی تہذیب کا بچشم خود مشاہدہ کر لیا۔ مسلمانوں کے اخلاقِ حسنہ، اخوت، اعلیٰ معیارِ زندگی اور اسلامی تہذیب کی برکات سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسری طرف اسلام کے تہذیبی اثرات اندلس اور صقلیہ Sicily کے راستہ اہلِ یورپ میں نفوذ کر رہے تھے۔ صقلیہ میں مسلمانوں کے بعد نارمن حکمران برسرِ اقتدار آئے۔ روجر دوم Roger II, 1112-1154 اور فریڈرک اوّل Fredric 1, 1154-1212 نے بالکلیہ عرب تہذیب و تمدن کو اختیار کر لیا تھا۔ یہ حکمران عرب علماء اور فضلاء کے بڑے قدر دان تھے۔ ان اثرات نے اہلِ مغرب کو برتر اسلامی علوم و فنون کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ یورپ کے مختلف ملکوں سے عیسائی طلبہ اندلس Spain کا سفر اسی طرح اختیار کرتے تھے جس طرح آج مسلمان ملکوں سے طلبہ یورپ جاتے ہیں۔ اس دور میں مسلمانوں کی تقلید میں یورپ کے اندر پہلی مرتبہ مدارس اور جامعات وجود میں آئیں۔ سب سے پہلے فریڈرک اوّل نے یونیورسٹی کے قیام کے لیے چارٹر (شاہی فرمان) عطا کیا۔ اس کے عطا کردہ ۱۱۵۸ء کے فرمان کی رُو سے بولون Bologne میں یورپ کی سب سے پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی۔[1]

---

[1] اسپین میں ولنشیا Velencia 1212 سلمانکا Salamanca 1230 اور مرسیا Mercia 1254 پرتگال میں لشبونہ Lishbon 1290 اور کوئمبر Coit ember.1300 فرانس میں ٹولوز Toulose 1230 اور اورلیئنز Orleans [illegible] 1224 [illegible] Padua 1212 [illegible] 1300

عربوں کے علوم و فنون کی طلب اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ پوپ کی جانب سے قائم کردہ تعلیمی کونسل نے ۱۳۱۲ء میں عربی زبان کی تعلیم کو ویانا Vienna پیرس Paris، بولون Bologne، آکسفورڈ Oxford اور سلمانکا Salamanca کی جامعات میں لازمی قرار دے دیا تھا۔[1] ان تہذیبی اثرات اور عوامل نے اہلِ مغرب کی آنکھیں کھول دیں۔ جہالت اور تاریکی کے پردے چاک ہونے لگے۔ جمود ٹوٹ گیا۔ ظلم اور حماقتوں کے خلاف حرکت پیدا ہونے لگی۔ بند زبانیں اب کھلنے لگیں۔

اور روما Roma 1244 انگلستان میں بیلیل Balliol 1266 اور پیٹر ہاؤس Peter House 1284 کی جامعات قائم ہوئی ہیں۔

بحوالہ:

Universities of Europe in the Middle Ages—Vol II—pages 30, 81-1895 by H. Roshdal.

[1] الفکر الاسلامی الحدیث و صلتہ بالاستعمار الغربی۔ للدکتور محمد البہی۔ دار الفکر بیروت مطبوعہ ۱۹۵۷ء، صفحہ ۵۸۲

دُوسرا باب

مسلکِ لادینیت کا آغاز

۱۴۵۰ء — تا — ۱۷۰۰ء

تحریکِ اصلاحِ دین

اِن حالات سے اہلِ کلیسا نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اُن کی تنگ دِلی، تعصب، ظلم وجور بدستور جاری رہا۔ پاپائے اعظم کو نشہ پندار تھا کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے۔ "زمین پر جو کچھ وہ جوڑ دیتا ہے، وہ آسمان پر بھی باقی رہتا ہے۔"

اس کے اقتدار کا یہ عروج تھا کہ پوپ گریگوری ہفتم Pope Gregory VII نے مقدس شاہنشاہِ رُوما ہنری چہارم Holy Roman Emperor, Henry کو دائرۂ مسیحیت سے خارج کر دیا تھا۔ پوپ اس وقت اطالیہ کے قلعہ کنوسا Canosa میں مقیم تھا۔ ہنری قلعہ کے دروازہ پر تین شب و روز ننگے سر اور ننگے پیر پڑا رہا، عاجزی کرتا رہا اور معافی مانگتا رہا، مگر پوپ نے دروازہ نہ کھولا۔ یہ واقعہ ۱۰۷۷ء میں پیش آیا۔[1]

دُوسری طرف جامعات کی تعلیمات نے اور طباعت کی سہولت نے (۱۴۵۰ء) عوام میں علم کی روشنی پھیلائی۔ ملک میں آزادانہ غور و فکر کی فضا پیدا کر دی حتّیٰ کہ خود کلیسائی نظام کے اندر کتنے ہی ایسے افراد پیدا ہو چکے تھے جو دل سے پوپ کے جبر و استبداد کو ناپسند کرتے تھے۔ ذہنیتوں کے تصادم نے سولھویں

---

[1] "The Ordeal of Civilization" by J. H. Robinson
Page 129—London, 1926

صدی کے آغاز میں انھیں ایک حادثہ سے دوچار کر دیا، جس نے وسعت اختیار کر کے "تحریکِ اصلاحِ دین" Reformation Movement کو جنم دیا۔ تین صدیوں سے جو گھٹن کی فضا محسوس کی جا رہی تھی، اس کا لاوا پھٹ پڑا۔ تحریکِ اصلاحِ دین کا آغاز جرمنی سے ہوا۔ پوپ زندگی میں گنہگار انسانوں کو مغفرت نامے فروخت کیا کرتا تھا۔ کلیسا کی آمدنی کا یہ ایک بڑا ذریعہ تھا۔ وہاں کے ایک پادری مارٹن لُوتھر Martin Luther, 1483-1546 نے پوپ کے اختیار

لُوتھر اسلامی تعلیمات سے متأثر تھا۔ ریکولڈ Recoid of Mounte Cross, 1243—1320 فلورنس Florence اطالیہ کا رہنے والا ایک راہب Dominican Monk تھا۔ اس نے قرآن مجید کا ترجمہ اور رد لکھا تھا اس کتاب کا عنوان تھا Confutation Al-Corani اس کا مقدمہ لُوتھر نے لکھا تھا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ اشبیلیہ، اُندلس Seville میں ۱۵۰۰ء میں طبع ہوئی تھی۔ (بحوالہ: Encyclopaedia Brittannica—Articale Recold) اِس لیے ضرور ہے کہ اس نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ قرآن مجید کے توحیدی مضامین سے ضرور واقف تھا۔ بعض آیات کی زد براہِ راست پوپ پر پڑتی ہے۔ مثلاً سُورۂ آلِ عمران کی یہ آیات:

"اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا رب نہ ٹھیراؤ" اور . . . . "اے اہلِ کتاب! ایسے قول کی طرف آ جاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا پروردگار نہ ٹھیرائے"

اس وجہ سے لُوتھر قرآن مجید کی تعلیمات کی اشاعت کو پسند کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بے سل سوئٹزرلینڈ میں جان اپرینس Johann Oporenus نے قرآن مجید کا ترجمہ شائع کرنا چاہا، لیکن شہری مجلس نے اس اقدام کی سخت مخالفت کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند سال قبل وینس کے اندر قرآن مجید عربی کے مطبوعہ نسخے پوپ کے حکم سے جلا دیے گئے تھے۔ اس موقع پر لُوتھر نے مداخلت کی اور اشاعت کے لیے راہ ہموار کی۔ اُس نے کہا اس کی اشاعت

کو چیلنج کر ڈالا۔ اور ۹۵ اعتراضات Theses پر اس سے مناظرہ شروع کر دیا۔ دُوسرے پادری بھی تائید کے لیے میدان میں نکل آئے۔ ایراسمس Erasmus 1466-1536 نے انگلستان میں، زونگلی Zwingly, 1486, 1531 نے سوئٹزرلینڈ میں، اور کال ون Calvin 1509-1564 نے جنیوا، اطالیہ میں اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ اِن مصلحین نے بندے اور خالق کے درمیان بلاواسطہ تعلق قائم کرنے پر زور دیا اور پوپ کی ہستی کو درمیان سے خارج کر دیا۔ انھوں نے عقل کی بالادستی کا بھی بڑے زوردار الفاظ میں اعلان کیا جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے تھے: "جو بات عقل کے خلاف ہے، وہ خدا کے بھی خلاف ہے۔" اس سادہ سے جملے کے بہت دُوررس نتائج نکلے۔ مصلحین کے یہ اعلانات پاپوسی مسیحیت کے لیے ایک بم سے کم نہ تھے۔ ساری کلیسائی مشینری ان باغیوں کے خلاف حرکت میں آگئی۔ پوپ نے ان کو دائرۂ مسیحیت سے خارج کر دیا۔ ان کے مقابلہ پر "مخالفینِ اصلاح تحریک" Anti Reformation Movement بڑے پیمانے پر فوجی نظم و ضبط کے ساتھ چلائی جس کو "جیسوئیٹ" Jesuits کہتے ہیں۔

اس کشمکش نے سارے یورپ میں ایک جنگِ عمومی کی صُورت اختیار کر لی۔ عوام اور خواص سب اِس جنگ میں کُود پڑے۔ بتدریج عوام کی ہمدردیاں جدید

(گزشتہ سے پیوستہ)

سے مسیح کی عظمت ثابت ہوگی، مسیحیت کا برحق ہونا ثابت ہوگا، مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا، اور شیطان کو زک پہنچے گی۔ اِس طرح وہ لاطینی ترجمہ ۱۵۴۲ء میں شائع ہُوا۔ اس کا مقدمہ لُوتھر نے اور Malanchthin نے مِل کر لکھا تھا۔ (بحوالہ:

Five Hundred Years of Printing, by A. S. Steinberg page 5
Penguin Book—1974

مصلحین کے ساتھ ہوتی چلی گئیں۔ اس جنگ میں بالآخر کلیسا کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اس کا دائرۂ اقتدار محدود ہو گیا۔ کیتھولک مذہب کی اجارہ داری کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اس کا حریف ایک نیا فرقہ پروٹسٹنٹ Protestant پیدا ہو گیا۔ بحیثیتِ مجموعی اہلِ کلیسا کی گرفت عوام پر ڈھیلی پڑ گئی۔ عوام کو آزادی کا سانس لینے کا موقعہ ملا۔ آزاد خیالی کی رَو کو بڑی تقویت حاصل ہو گئی۔

نشاۃِ ثانیہ

اِس زمانہ میں یورپ میں ایک نئی تحریک اُبھری۔ روایتی طور پر اس کا تعلق تُرکوں کی فتحِ قسطنطنیہ سے بتلایا جاتا ہے۔ (۱۴۵۳ء) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اِس رُجحان کی آبیاری گزشتہ دو صدیوں سے عربی اثرات کر رہے تھے۔ بہرکیف یونانی پناہ گزین اپنے اسلاف کی کتابیں لے کر یورپ خصوصاً اطالیہ میں آگئے۔ اطالیہ اس دَور میں اسلامی ممالک سے تجارت کرنے کے باعث بڑا خوش حال اور مہذب ملک تھا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے وہاں علم کی نئی لگن پیدا ہو گئی، جو بتدریج سارے یورپ میں پھیل گئی۔ اہلِ یورپ کی نگاہوں میں نیا علمی اُفق آگیا۔ علم کی نئی لہر نے سارے برِاعظم کو جھنجھوڑ ڈالا۔ صدیوں کا خوابیدہ ذہن انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اِس علمی شغف کا اِنسانی زندگی کے ہر شعبے پر اثر پڑا۔ زبان، مذہب، فلسفہ، سائنس، ادب، فنونِ لطیفہ، ایجادات اور سیاحت سب اس سے متاثر ہُوئے۔ نئی نئی ایجادیں ہوئیں۔ نئے نئے ملک دریافت ہُوئے۔ مطبع کی ایجاد نے اشاعتِ علم میں بڑی مدد کی۔

مذہبی جھگڑوں سے تنگ آکر اس دَور میں "انسان دوستی" Humanism کے مسلک کو خُوب ترقی ہُوئی۔ اس تحریک نے کلیسائی دَور (۵۰۰ء تا ۱۴۰۰ء) کے علوم و فنون کو [illegible] سے ناکارہ قرار دے دیا۔ اس دور

میں مسیحیت کے علوم سے عام بیزاری پیدا ہو گئی۔ مُشرک یونان اور مُشرک رُوما کے لادینی اور مادّی علوم سے بے حد شغف بڑھ گیا۔ یونانی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم بڑے ذوق و شوق سے جاری ہو گئی۔ انسان کی ترقی کے لیے یونانی علوم کو "اصل حقیقت" قرار دیا گیا۔ کلیسا کے زیرِ اثر اہلِ یورپ ان علوم کو فراموش کر چکے تھے۔ ان علوم کی دوبارہ بازیافت کو "نشاۃِ ثانیہ" Renaissance یعنی "جدید زندگی" کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ اس تحریک کو تقریباً ڈیڑھ سو سال تک (۱۴۵۰ء تا ۱۷۰۰ء) بڑا عروج حاصل ہُوا۔ بلاشُبہ اس تحریک نے علم کا ذوق و شوق بے اندازہ بڑھا دیا۔ مگر افسوس اس تحریک نے ذہن کا رُخ لادینی اور مادّی علوم کی جانب پھیر دیا۔ اس کے بعد ہی مذہبی علوم سے اوّل بے اِعتنائی اور بعد میں بیزاری کا رویّہ پروان چڑھا۔

سائنسی تحقیقات کے لیے طریقۂ کار

آغازِ کار میں سائنس دانوں نے یہ طریقۂ کار اختیار کیا کہ سرِدست ہم صرف ان حقائق سے بحث کرتے ہیں جو ہمارے حواس کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ جو ناپے جا سکتے ہیں اور تولے جا سکتے ہیں۔ اور ان حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو حواس کی گرفت سے بالا ہیں۔ جو نہ ناپے جا سکتے ہیں اور نہ تولے جا سکتے ہیں۔ سائنسی تحقیقات کے لیے یہ محض ایک مفروضہ تھا' اِک طریقۂ کار تھا۔ حقیقت کا کُلی ادراک نہیں تھا۔

اِس طریقۂ کار کی بدولت سائنسی علوم کا دائرۂ کار عالمِ محسوسات اور عالمِ مادیات قرار پایا۔ اِس میدان میں سائنس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ انسان کے علم میں بے حد و حساب اضافہ کر دیا۔ عالمِ طبعیات پر انسان کی گرفت حیرت ناک حد تک وسیع ہو گئی۔ حیرت انگیز اور محیر العقول ایجادات نے انسان کے عیش و آرام میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ تیز رفتار سواریوں نے انسان کو دُنیا کے

ایک کنارے سے دُوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔ زمان و مکان کی طنابیں کھنچ گئیں۔ خُشکی، تری اور ہوا پر انسان قابض ہو گیا۔ امراض اور بیماریوں کو بڑی حد تک کنٹرول کر لیا گیا۔ اِس غیر معمولی کامیابی سے خُود سائنس داں حیرت میں رہ گئے۔ کامیابی کا نشہ ان پر سوار ہو گیا۔ اب ان کا ذہن بہک گیا۔ اب انھوں نے طریقۂ کار کے عملی مفروضہ کو حقیقتِ ثابتہ تسلیم کر لیا۔ انھوں نے محسوسات کو ہی اصل حقیقت قرار دے دیا اور غیر محسوسات کے وجود کا انکار کر دیا۔ یہ حدود سے صریحاً تجاوز تھا۔ اس کے بعد سے سائنس کی تحقیقات میں جو ذہنیت کارفرما رہی ہے وہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کائنات کو ایک مشینی ساخت میں تبدیل کر دیا جائے' جو خالق اور صانع سے آزاد خُود بخُود بن گئی ہے اور اب خُود بخُود ہی چل رہی ہے۔ اس ذہنیت کا نام لادینیت ہے۔ اس مفروضہ نے انھیں اصل حقیقت سے دُور کر دیا۔

سائنس دانوں کی ذہنیت کا ہکسلے نے ان الفاظ میں مذاق اڑایا ہے۔

"ایک طفلِ کمسن کی طرح مادی حقائق کے سامنے بیٹھ جائیے۔ تمام سابقہ تصورات سے اپنے ذہن کو خالی کر لیجئے۔ اخلاص کے ساتھ ان مادی حقائق کے پیچھے پیچھے چلتے رہیئے۔ خواہ وہ آپ کو کسی غار میں دھکیل دیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر آپ فطرت سے کچھ نہ سیکھ سکیں گے۔"

اہلِ کلیسا کا سائنسدانوں سے تصادم

نشۂ علم سے سرشار سائنس دان اور جدید علم کے متوالے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک حادثہ سے دوچار ہو گئے۔ یہ سانحہ کلیسا اور

سائنس دانوں کے تصادم کی صورت میں رُونما ہوا۔ ان سائنس دانوں کا سابقہ پالوسی مسیحیت Pauline Christianity کے پادریوں سے پڑا، جو انتہائی تنگ نظر ہونے کے علاوہ اقتدار کے حریص بھی تھے۔ اہلِ کلیسا ادنیٰ درجہ کے اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اُدھر سائنس دانوں اور فلسفیوں کی اکثر تحقیقات اہلِ کلیسا میں مروج افکار و نظریات سے ٹکراتی تھیں۔ یہ اختلاف اہلِ کلیسا کے نزدیک ارتداد کے مترادف تھا۔ اس لیے کلیسا کا تعذیبی شکنجہ ان سائنس دانوں کے خلاف حرکت میں آگیا۔ کتنے ہی سائنسدانوں کو علم کی قربان گاہ پر چڑھا دیا گیا۔ کتنے ہی سائنسدانوں کو اپنے فاسد خیالات سے رجوع کرنے پر مجبور کیا گیا۔[1]

یہ سانحہ جدید علوم اور سائنس کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس ایک واقعہ نے سائنس اور جدید علوم کا رُخ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اہلِ کلیسا سے نفرت اور مذہب بیزاری کی طرف موڑ دیا۔ اس حادثۂ فاجعہ کا اثر سائنس دانوں کے تحت الشعور میں داخل ہو گیا اور پھر کبھی ان کے دل و دماغ سے محو نہ ہو سکا۔ اہلِ کلیسا کی یہ ظالمانہ تدابیر علمِ جدید کی رَو کو روکنے میں بالکل ناکام رہیں۔ مگر اس کشمکش میں اہلِ کلیسا اپنا وقار کھو بیٹھے۔ اُدھر سائنس دانوں کی قوت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ آیا جب انھوں نے سارے یورپ پر فکری اور سیاسی غلبہ حاصل کر لیا۔ اہلِ کلیسا کے لیے انھوں نے

---

[1] ہسپانوی مذہبی رہنما سروٹ Servetus. 1511—1553 کو پروٹسٹنٹ رہنما جان کالوِن کے حکم سے زندہ آگ میں ڈال دیا گیا۔ اطالوی فلسفی اور سائنس دان برونو Bruno 1548—1600 کو کیمو فری واقع روم میں ۱۲ فروری ۱۶۰۰ء کو زندہ جلا دیا گیا۔ اطالوی ماہرِ فلکیات گلیلیو Galeleo, 1564—1642 کو تین سال تک قید خانہ میں بند رکھا گیا، جہاں وہ توبہ نامہ کا وِرد کرتا رہا۔

زندگی تنگ کر دی۔ مسیحیت کو زندگی کے تمام گوشوں سے بے دخل کر کے کلیسا کی چہار دیواری میں مقید اور محبوس کر دیا۔

نفرت ایک اندھا جذبہ ہے۔ اس میں پھیلنے اور بڑھنے کا غیر معمولی رُجحان پایا جاتا ہے۔ اسے کسی ایک مقام پر قیام و قرار نہیں ہے۔ سائنس دان اہلِ کلیسا کی ستم رانیوں کا ہدف بنے، اس لیے اہلِ کلیسا کے خلاف ان کا غیظ و غضب قابلِ فہم ہے۔ پھر انھوں نے مزید ترقی کی اور کلیسا سے بیزار ہو گئے۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھایا، مسیحیت سے بھی دامن چھڑا لیا۔ آخر میں وہ ہر قسم کے اخلاق اور مذہب کے منکر ہو گئے۔ انھوں نے خدا اور آخرت بلکہ ہر نوع کے مابعد الطبعی تصور کے خلاف بغاوت کر دی۔ انکار کی لَے کو اہلِ مغرب بہت دُور تک لے گئے۔

~ لَاکلِیسَا، لَاسَلاَطِیْن، لَا اِلٰـہ

اب ان کی دلچسپیوں کا محور اور مرکز صرف عالمِ طبعیات اور عالمِ مادیات رہ گیا۔

لادینی تحریک

غیر محسوس اور غیر مادی حقائق کا برملا انکار کرنے کے بعد مذہب بیزاری Theophobia جدید نظامِ فکر کا اہم عنصر قرار پایا۔ مغرب میں اب صرف وہ علم معتبر ہے جس سے لادینی فکر کو تقویت ملتی ہو۔ سائنس کا ہر ہم سفر شعوری یا غیر شعوری طور پر مذہب بیزاری کے جذبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مغرب کے حکماء اور فلاسفر کی اس ذہنیت کو "لادینیت" Secularism کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یہ "لاادریت" Agnosticism سے بالکل مختلف نظریہ ہے۔ یونان کے "لاادریہ" فلسفی لاعلمی کے مدعی تھے۔ لیکن جدید دَور کے حکماء اور

فلاسفہ مذہب دشمنی کے علم بردار ہیں۔ خُدا کے تصوّر کو حذف کرنا اور مادیت کے ذریعہ کائنات کی ہر شے کی تشریح کرنا اب سائنس کا منتہائے مقصود بن گیا ہے۔ اس کا واضح ثبوت فرانس کے سائنس داں لاپلاس LA PLACE کے جواب سے ملتا ہے۔ اس نے اپنی طبعیاتی تصنیف نپولین (۱۸۰۴ء تا ۱۸۱۴ء) کو پیش کی۔ نپولین نے لاپلاس سے دریافت کیا "میں نے آٹھ سو صفحات کی کتاب میں خدا کا لفظ کہیں نہیں پڑھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" لاپلاس نے جواب دیا "آقا! اب اس فارمولے کی ضرورت پیش نہیں آتی"۔

بہرکیف بتدریج لادینیت نے مغرب میں ایک نظامِ حیات کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس کے چند اصول اور قواعد وضع کرلیے گئے ہیں۔ اہلِ مغرب دینی عقائد جیسی پختگی کے ساتھ ان پر یقین رکھتے ہیں۔ اور عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس لادینی تہذیب مغرب کے اصولِ موضوعہ یہ ہیں:

۱۔ انسانی زندگی کی تمام جدوجہد اور دلچسپی کا مرکز صرف یہ دُنیا اور اس کے معاملات ہیں۔ دُوسری دُنیا ـــــ خُدا اور آخرت ـــــ کا اوّل تو کوئی وجود نہیں ہے، اور اگر ہو بھی تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔

۲۔ انسانی زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی کے لیے ہماری عقل کافی ہے۔ رہنمائی کے لیے کسی وحیِ الٰہی یا آسمانی ضابطۂ حیات کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس طرح انھوں نے مذہب سے اور اخلاق سے پیچھا چھڑا لیا۔

۳۔ مذہب اور اخلاق سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کی خلش فطرتِ انسانی میں بار بار محسوس ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مغربی مفکرین نے منافقت اور دوعملی Duplicity کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دیا۔ یہ منافقت انسانی زندگی کی تین سطحوں Levels پر نمایاں ہے:

انفرادی اور اجتماعی زندگی میں،

ریاستی اور مذہبی معاملات میں،

قومی اور بین الاقوامی معاملات میں،

اِس تفریق نے اہلِ مغرب کی زندگی کو خانوں میں تقسیم کردیا۔ اب وہاں یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی انفرادی زندگی میں دھوکہ باز اور بدترین اخلاق کا حامل ہو لیکن اجتماعی معاملات میں راست باز اور اصول پسند ہو۔ اب کوئی شخص اس کی نجی زندگی پر گفتگو نہیں کرسکتا۔ انسانی زندگی ایک وحدت ہے۔ یہ تفریق ضرور رنگ لائے گی۔ آج اہلِ مغرب کی زندگی میں ہر جگہ منافقت اور دوعملی سرایت کرچکی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی تضادات کا مجموعہ بن گئی ہے تضادات کا نتیجہ اِنتشار اور اختلال کی صُورت میں ظاہر ہونا یقینی ہے۔ جس نظامِ حیات کی بنیاد منافقت پر ہوگی اس کو استحکام نصیب نہیں ہوسکتا۔ جلد یا بدیر اس میں اضطراب کی لہریں سر سے اُونچی ہوجائیں گی۔

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

ہرکیف گزشتہ چار صدیوں سے کم و بیش یہی فکری رُجحان اہلِ یورپ کے دل و دماغ پر تسلط جمائے ہُوئے ہے۔ دُنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اہلِ یورپ نے یہی فکری رُجحان ساری دُنیا میں پھیلا دیا۔ آج ساری دنیا کا علمی مزاج اور اندازِ فکر لادینیت کی طرف مائل ہے۔

مسیحی روایات کی پُشت پناہی

لادینی نظریہ کی وُسعت اور مقبولیت پر گفتگو کرنے سے قبل ان اسباب اور عوامل کا سراغ لگانا ضروری ہے جن کی بنا پر اس نظریہ کو فقید المثال کامیابی حاصل ہوئی۔ عام طور پر یہ اسباب محققین کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے ہیں عمرانیات کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ اجتماعی زندگی خواہ کسی مرتبہ کی ہو، اس کو بسر کرنے کے لیے عقائد کا ایک فکری ڈھانچہ اور مذہب اور اخلاق کا ایک ضابطہ نہایت ضروری ہے۔ لادینیت اور مادیت کے عَلَم بردار خواہ کچھ بھی دعویٰ

کریں، عقائد اور اخلاق کی بنیادیں فراہم کیے بغیر کوئی معاشرہ نہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔ لادینیت ایک منفی اندازِ فکر ہے۔ زندگی کی برومندی کے لیے مثبت اندازِ فکر درکار ہے۔ مادیت بالآخر خود غرضی کو پروان چڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ خود غرضی اجتماعیت پسندی کی عین ضد ہے۔ اس لیے لادینیت اور مادیت بذاتِ خود نہ معاشرہ کے لیے اخلاقی بنیادیں فراہم کر سکتی ہیں اور نہ باہمی تعاون کے لیے کوئی محرک فراہم کر سکتی ہیں۔ ان کی فطرت میں مضمر تخریبی قوتوں کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کسی معاشرہ کے لیے وجۂ استحکام نہیں بن سکتیں۔ ان سے انتشار اور اختلال کی قوتیں ابھرتی ہیں۔

مغرب میں جب لادینی تحریک نے اپنے سفر کا آغاز کیا، اس وقت مسیحیت کا صدیوں کا اندوختہ دینی، اخلاقی اور تہذیبی سرمایہ اہلِ مغرب کے دل و دماغ میں رچا بسا موجود تھا۔ مذہب اور مذہبی اخلاق کی بنیاد پر منظم معاشرہ وہاں موجود تھا۔ اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ اس کو ہر طرح سے معاشرتی استحکام حاصل تھا۔ مسیحیت کی فراہم کردہ یہ وہ تہذیبی اور اخلاقی بنیادیں تھیں جن پر لادینی تحریک آگے بڑھی۔ اگر سائنس کو اور لادینی تحریک کو خود اپنی بنیادیں فراہم کرنا پڑتیں تو پھر یہ عظیم الشان کامیابی مشتبہ کیا، ناممکن تھی۔ لادینیت اور مادیت میں مضمر خرابیاں فوراً ظاہر ہونا شروع ہو جاتیں

انیسویں صدی کے اختتام تک مسیحی روایات کی گرفت یورپ کے معاشرہ پر اتنی قوی تھی کہ سہ صد سالہ لادینی اور مادی تحریک کے مذموم نتائج پوری طرح ظاہر نہ ہو سکے۔ مذہب کا اور اخلاق کا انکار کر دینے کے بعد اب ان مذہبی اور اخلاقی روایات میں اضافہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ قدیم سرمایہ میں روز بروز کمی ہوتی چلی آ رہی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) نے اس سرمایہ کا دیوالیہ نکال دیا۔ اس وقت انسان دشمن تحریکوں فسطائیت Fascism، اشتمالیت Socialism، اشتراکیت Communism

نے مغربی معاشرہ میں سر ابھارنا شروع کر دیا۔ دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) نے رہے سہے اخلاقی سرمایہ کو بھی غارت کر دیا۔ اب مغربی معاشرہ قدیم تہذیبی اثرات سے بالکل مفلس اور قلاش ہو گیا۔ مذہبی اور اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل گیا۔ جدید نسلیں مسیحیت کے اثرات سے عاری ماحول میں پروان چڑھی ہیں۔ اس نسل میں لادینیت اور مادیت اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ ٹیڈی Teddy، ماڈ Mod، بیٹلز Beatles اور ہیپی Happy لادینی مادی تحریک کی جائز ذریات ہیں۔ ان کے دل پسند مرغوبات ماری جوانہ Maurijuana، ہیروئن Heroine، کوکین Cocaine، ایل ایس ڈی L. S. D.، بھنگ، چرس وغیرہ منشیات ہیں، چار سو سال سے مادیت اور لادینیت کے جس عفریت Franken stein کو جگایا جا رہا تھا، وہ اب جاگ اٹھا ہے۔ ہوس رانی کا یہ برہنہ دیو اخلاقی اور تہذیبی روایات سے قطعاً بیگانہ ہے۔ "لاحیات" کا تخریبی تیشہ اس کے ہاتھوں میں ہے ۔ لاکلیسا، لاسلاطین، لاالٰہ کا نعرہ اس کی زبان پر ہے۔

ظلم و ستم بدستور جاری

بلاشبہ لادینی تحریک کے فروغ پا جانے سے اہلِ مغرب کی زندگیوں میں انقلابِ عظیم برپا ہو گیا تھا۔ تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت میں آرام و آسائش کی نئی نئی راہیں نکل آئی تھیں۔ دین کی اہمیت کم تر ہو گئی۔ اخلاقی قدریں پامال ہو گئیں۔ لیکن اس کے وہ نتائج برآمد نہیں ہوئے جس کے مدعی لادینی تحریک کے علم بردار تھے جس کا دعویٰ انسان دوستی کے مدعیوں کو تھا یعنی ملک میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو گا اور تحمل اور رواداری کا چلن ہو گا۔ ترکِ مذہب کے بعد حالات اور بھی بدتر ہو گئے۔ وہی انانیت اور خود پسندی کا

دَور دَورہ تھا۔ دَورِ تنویر Age of Enlightenment میں اٹھارھویں صدی عیسوی تک حکمرانوں اور اہلِ کلیسا کے مظالم کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اختلافِ رائے پر بدستور مظالم توڑے جاتے تھے۔ آزاد خیالی پر ہر جگہ بندش تھی۔ مخالفانہ رائے اور افکار پیش کرنے والوں کو بدستور اذیت ناک سزائیں دی جارہی تھیں۔

بادشاہوں کے اِستبداد اور تحکم کا سلسلہ حسبِ سابق جاری تھا۔ رُوس کی ملکہ کیتھرائن Carherine, 1762-1796 نے کاشت کاروں کی زبوں حالی پر ایک کتاب لکھنے پر اسکندر ریڈ شیف Alexander Red Schiev کو سائبیریا کے برفستانوں میں جلاوطن کر دیا تھا۔ ایکویڈور، وسطی امریکہ میں ڈاکٹر اسپیجو Dr. Espego کو "اعلانِ حقوقِ انسانی" Declaration of Human Rights دوبارہ شائع کرنے پر ہسپانوی حکمرانوں نے عذاب دے کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ بابیہ Babia ، ارجنٹائن میں پرتگالی حکمرانوں نے چار ریڈیکل سیاست دانوں کو جمہوری مساوات کا مطالبہ کرنے پر قتل کرا دیا تھا۔

اس دَور میں یورپ کے جتنے روشن خیال سیاست دان اور وزراء تھے ان سب کا انجام بہت خراب ہُوا۔ فرانسیسی وزیرِ اعظم ٹرگو Turgot, 1.727-1781 کو معزول کر دیا گیا۔ دُوسرے فرانسیسی سیاست دان نیکر Necker, 1732-1804 کو معزول اور علیحدہ کر دیا گیا۔ رمفورڈ Count Von Rum Ford, 1753-1814 امریکی کا ملک سے اخراج عمل میں آیا۔ عظیم پرتگالی سیاست دان پوم بال Pomball, 1699-1782 کی حد درجہ تذلیل کی گئی۔ جان موزر John Moser جیل خانہ میں پڑا سڑتا رہا۔ ڈنمارک کے مشہور سیاست دان اسٹرنیسی Straunensse کو قتل کر دیا گیا۔ برسو Brissot کو سُولی پر چڑھا دیا گیا۔ فرانسیسی

فلسفی کنڈرس Conderect, 1743-1794 نے بور۔ لارائن Bour -la-Reine. کے قید خانہ میں خودکشی کر لی۔ اس وقت لاطینی شاعر ہوریس کی کتاب اس کے سینہ پر دھری ہوئی تھی۔

مذہبی احتساب بھی اسی شدت سے جاری تھا۔ فرانسیسی باشندہ کالاس Calas, 1698-1752 مذہب کال وِن کو ماننے والا تھا۔ کیتھولک فرقہ والوں نے اسے سخت عذاب دے کر ہلاک کر دیا۔ لابار La-Barre کو زندہ جلا دیا گیا۔ میلان، اطالیہ کے ایک گرجے میں ایک نوجوان نے "آزادی زندہ باد" کا نعرہ لگا دیا تھا۔ اس کی پاداش میں اس کو عذاب دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ انیسویں صدی عیسوی تک حالات بدستور خراب تھے۔ انگلستان میں ۱۸۷۱ء تک ڈزنٹر Dissenter فرقے والوں پر آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات کے دروازے بند تھے۔ ۱۸۶۲ء میں ایک پروفیسر کا جامعہ کیمبرج میں صرف اس وجہ سے تقرر نہ ہو سکا کہ اس کا تعلق یُونی ٹیرین Unitarian فرقے سے تھا۔ پادری روشے Rochette. کو پروٹسٹنٹ فرقے کے مطابق گرجے میں سروس ادا کرنے پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اینگلی کن فرقہ کیتھولک کو، اور کیتھولک فرقہ اینگلی کن کو آج بھی آئرستان میں برداشت کرنے کو تیار نہیں۔

آزاد خیالی کے اظہار پر ہر جگہ پابندی تھی۔ حکمران طبقہ آزاد خیال افراد کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ روسو Rousseau,1712, 1778 نے فرانس سے بھاگ کر انگلستان میں پناہ پکڑی۔ رینال Renal ہالینڈ جا کر چھپ گیا۔ والٹیر Voltair, 1694-1778 نے فرانس سے بھاگ میں جنیوا میں جان بچائی۔ وہاں بھی اس کی کتاب "فلاسوفیکل ڈکشنری" Philosophical Dictionary کو برملا نذرِ آتش کیا گیا۔ پریسٹلے Preistley, 1753-1804 انگریز سائنس دان نے پین سلوانیا، امریکہ میں پناہ پکڑی۔ وان ڈر کیمپ —

Van-der-Camp بھاگ کر نیویارک چلا گیا۔ بدنصیب ابادوبے Abbe-de-Bourge کو ایک بے ضرر سی کتاب لکھنے پر لوہے کے پنجرہ میں محبوس کر دیا گیا۔ جہاں سے مر کر ہی اُس کی جان چھوٹی۔ انگریزی سیاست دان تھامس پین Thomas Paine نے ۱۷۹۱ء میں "حقوقِ انسانی" The Rights of Man کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جو فوراً ہی ممنوع قرار دے دی گئی۔ انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء کے بعد سے فرانسیسی مصنفین کی کتابوں کا رُوس میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مشہور جرمن فلسفی کانٹ کو مذہب پر لیکچر دینے سے منع کر دیا گیا تھا۔

علمی انکشافات کے اظہار پر بھی بعض جگہ بدستور پابندی عائد تھی۔ فرانس میں سوربون Sorbonne کی جامعہ نے ولیم ہاروے Harvey, 1578-1657 کے نظریۂ دورانِ خون کو رد کر دیا تھا۔ پرتگال کی جامعہ سلامنکا Salamanca نے نیوٹن Newton,1642-1727 کے نظریۂ کششِ ارضی کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈنمارک کے چرچ نے چند طبی اصلاحات کی مخالفت کی تھی، حالانکہ ان کا پیش کرنے والا ملک کا وزیرِ اعظم اسٹرینسی تھا۔ امریکہ کی کئی جامعات نے ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کی شدید مخالفت کی تھی۔

ڈیڈرو Didrot ڈالمبس D'Alembest اور گرم Grimme نے فرانس میں پہلی مرتبہ دائرۃ المعارف لکھی۔ ۱۷۵۱ء میں اس کو شائع کیا۔ شائع ہوتے ہی اس کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ۱۷۵۲ء میں حکومت نے اس کو ضبط کر لیا۔ اور عوام نے اس کو نذرِ آتش کر دیا۔ ۱۷۵۹ء میں پوپ نے بھی اس کے خلاف فتویٰ دلایا۔ بیس سال کی کشمکش کے بعد بالآخر ۱۷۷۲ء میں دنیا کی پہلی دائرۃ المعارف کو اشاعت کی اجازت ملی۔ انیسویں صدی کے وسط تک حالات کی یہی رفتار تھی۔

تیسرا باب

لادینی نظریہ کی فتوحات

۱۵۰۰ء ــــ تا ــــ ۱۹۰۰ء

عالمِ طبیعیات

لادینی تحریک چار سو سال میں طویل سفر طے کر کے موجودہ منزل تک پہنچی ہے ہزاروں علماء اور سائنس دانوں نے اس قافلہ کو یہاں تک پہنچائی ہے۔ ان میں سے بعض کے کارنامے سنگِ میل کا حکم رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے عالمِ طبعیات کے نئے نئے میدانوں میں لادینی تحریک کو گامزن کیا ہے بعض مشہور و معروف سائنس دانوں سے ہم ذیل میں تعارف حاصل کرتے ہیں۔

یہاں چند امور کا ملحوظِ خاطر رہنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے پیشِ نظر سائنس اور فلسفہ کے انکشافات اور تحقیقات پر ناقدانہ گفتگو کرنا نہیں ہے۔ یہاں فلسفیانہ افکار اور سائنسی انکشافات سے صرف اس حیثیت سے تعرض کیا جا رہا ہے کہ یہ لادینیت کی تحریک کو ترقی دینے کا سبب بنے ہیں۔ دُوسری بات یہ ہے کہ یہاں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا ہے کہ یہ سب فلاسفہ اور حکماء ملحد تھے یا بے دین تھے۔ نہیں، بلکہ بعض تو ان میں سے پکے دیندار اور سخت مذہب پرست تھے۔ جس بات کی طرف یہاں توجہ دلائی جا رہی ہے وُہ یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سب سائنس داں وقت کی لادینی رَو میں بہتے چلے گئے۔ ان کی سوچ کا انداز وہی تھا جو منکرینِ خدا کا تھا۔ ان کے قلبی عقائد ان کے اندازِ فکر پر اور ان کی تحریروں پر اثر انداز

نہیں ہوتے۔ ان کی فکری کاوشوں سے لادینی تحریک کو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں سے بعض لوگوں نے صرف اہلِ کلیسا کے باطل افکار اور مزعومات کی تردید پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ طیش میں آ کر نفسِ مذہب کا اور حقائقِ ثابتہ کا بھی انکار کر ڈالا، جس کے لیے ان کے پاس کوئی معقول بنیاد موجود نہیں تھی۔

۱۔ اِنسان کی ناقدری

کوپرنیکس Copernicus, 1473-1543 (پولینڈ) نے سورج کو کائنات کا مرکز ثابت کیا جس کے گرد تمام سیارے بشمولیت زمین گھومتے ہیں۔ یہاں سے ضمنی نتیجہ یہ نکالا گیا کہ زمین کا باشندہ انسان بھی اشرف المخلوقات نہیں ہے، بلکہ ایک معمولی مخلوق ہے۔ حالاں کہ زمین کو مرکز ماننے یا نہ ماننے سے اس مسئلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ساری کائنات میں صرف زمین پر ہی حیات موجود ہے اور تمام حیوانوں میں صرف انسان ہی خود شعوری کی صفتِ اعلیٰ کا حامل ہے۔ اِس لیے صرف انسان ہی بجا طور پر اشرف المخلوقات کے منصبِ رفیع کا اہل ہے۔

۲۔ غیر کمیتی اجزا کی نظر اندازی

گلیلیو Galileo, 1562-1642 (اطالیہ) نے اشیاء کی صفاتِ اولیہ اُن کو تسلیم کیا جو ناپی جا سکتی ہیں اور تولی جا سکتی ہیں۔ جیسے رقبہ، وزن، حجم وغیرہ۔ اور صفاتِ ثانویہ ان کو تسلیم کیا جو نہ ناپی جا سکتی ہیں اور نہ تولی جا سکتی ہیں، جیسے صوت، رنگ، بو وغیرہ۔ اس طرح اس نے کمیت کو اجزائے غیر کمیت سے جُدا قرار دیا۔ اس بُنیادی تفریق کے نتائج بہت گمراہ کن اور دُور رس نکلے۔ اس تفریق کے لیے کوئی معقول بنیاد نہیں تھی۔

۳۔ رُوح کی نظر اندازی

ڈیکارٹ Descartes; 1597-1650 (فرانس) نے رُوح کو مادی جُزو سے اور ذہن کو جسمانی جزو سے جُدا قرار دیا۔ پھر مادہ اور جسم کو اہمیت دی اور رُوح اور ذہن کو نظر انداز کر دیا۔

اس طرح رُوح اور مادہ کا لاینحل عقدہ پیدا ہو گیا۔ یہ سب بلا تحقیق اور بلا دلیل تحکمانہ انداز میں کر دیا گیا۔ ذہن اور جسم کی تفریق اور رُوح اور مادہ کی تفریق ذہنِ انسانی کی تجریدی خاصیت کا کرشمہ ہے۔ ورنہ درحقیقت ذہن اور جسم، رُوح اور مادہ ایک بسیط واقعیت ہے۔ بلاشبہ اس طریقۂ کار سے سائنس کو سہولت حاصل ہو گئی، مگر انسانیت انحطاط اور زوال کے راستہ پر چل پڑی۔

۴۔ کائنات بغیر خالق

اسحاق نیوٹن Isac Newton, 1642-1727 (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے، اور اب خود بخود چل رہی ہے۔ کسی صانع اور خالق کی ضرورت نہیں۔ یہاں چند طبعی قوانین کی کارفرمائی ہے۔ اس طرح اس نے کائنات کو تخلیقِ خداوندی ماننے سے عملاً انکار کر دیا۔

۵۔ مادّہ غیر فانی

لوائے زر Lavoisier, 1743-1794 (فرانس) نے دعویٰ کیا کہ مادہ غیر فانی ہے۔ یہ اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے، مگر فنا نہیں ہوتا۔ اس سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ یہ دُنیا بھی غیر فانی ہے۔ اس طرح مذہب کے دعویٰ فنائے کائنات کو غلط قرار دے دیا گیا۔

۶۔ حقیقی وجود مادّہ کا ہے

ٹائٹ P.G. Tait, -1876 (امریکہ) نے دعویٰ کیا کہ کائنات میں حقیقی وجود صرف مادّہ کا ہے۔ انسان مادّہ کو نہ فنا کر سکتا ہے، نہ پیدا کر سکتا ہے۔

۷۔ انسانیت کی تذلیل

ہارلو شیپ لے Harlow Shapley, (امریکہ) نے دعویٰ کیا کہ حیات چند سیاروں کی طویل زندگی میں ایک عارضی سا اُبھار ہے۔ جس کا مطلب یہ نکالا گیا کہ کائنات میں انسان کا وجود ایک بے جا مداخلت ہے۔ یعنی انسانی زندگی ایک غیر

اہم واقعہ ہے۔

۸۔ تخلیقِ انسانی بغیر خالق

ڈارون Darwin, 1809-1882 (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ طبعی قوانین کے زیرِ اثر دُنیا میں حیات نمودار ہوتی ہے۔ حیات نے یک خلیہ جرثومہ سے ترقی کرتے کرتے بالآخر انسان کی شکل میں ظہور کیا ہے۔ جس سے ضمنی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ تخلیق کا یہ کارخانہ بغیر خُداوند تعالیٰ کے چل رہا ہے۔ اس طرح مذہب کے دعویٰ خالقیت کا انکار کر دیا گیا۔

ڈارون کے زیرِ اثر جو حیاتیاتی علم مدوّن ہُوا ہے، وہ بتاتا ہے کہ کسی نامعلوم زمانہ میں اِتفاقاً، ایک مرتبہ، خود بخود کونیاتی شعاعیں Cosmic Rays مجسّم بن گئیں۔ اِس طرح مادّہ وجود میں آگیا۔ پھر نامعلوم زمانہ میں اِتفاقاً ایک مرتبہ، خود بخود مادّہ سے "حیات" Life نمودار ہو گئی۔ حیات نے مختلف مراحل میں ترقی کی ہے، جس کی تشریح ڈارون نے اپنے مشہور "نظریۂ ارتقا" کے ذریعہ کی ہے۔

وہ کہتا ہے سب سے پہلے مادّہ سے کسی نامعلوم زمانہ میں اِتفاقاً، ایک مرتبہ، خود بخود "یک خلیہ حیوان" One Celluer Amoeba پیدا ہُوا۔ ایک طویل زمانہ گزر جانے کے بعد یک خلیہ حیوان سے "خُود بخود" زحافات Reptile پیدا ہو گئے۔ پھر ایک طویل زمانہ گزر جانے کے بعد خُود بخود زحافات سے "حیوانات ذی فقر" Vertebrate پیدا ہو گئے۔ پھر ایک طویل زمانہ گزر جانے کے بعد خود بخود ذی فقر سے "پستانیے" Mammal پیدا ہو گئے۔ پھر ایک طویل زمانہ گزر جانے کے بعد پستانیوں سے خُود بخود "بن مانس" Fseudo Sapien پیدا ہو گئے۔ پھر ایک طویل زمانہ گزر جانے کے بعد بن مانس سے خُود بخود "انسان" Homo Sapien پیدا ہو گئے۔ انسان صاحبِ فہم اور صاحبِ شعور ہے۔

عام مشاہدہ یہ ہے کہ کروڑوں سال سے حیوانات کی تمام انواع — یک خلیہ، زحافات، ذی فقر، پستانیہ، چمپانزی — آج بھی اس سرزمین میں اسی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ ان میں کوئی ترقی نہیں ہُوئی۔ صرف ایک مرتبہ ان کی قوم کے ایک خُوش بخت فرد نے ترقی کی تھی اور وہ برتر نوع میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک پھر کسی فرد نے یہ سعادت حاصل نہیں کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ سائنس کی دُنیا تو عِلّت و معلول Law of Causation کی دُنیا ہے۔ یہاں تو لزوم اور جبر Necessity ہے۔ جب بھی عِلّت موجود ہو گی، نتیجہ ضرور ظاہر ہو گا۔ یہاں اعادہ ضروری ہے۔ بیج سے کل بھی درخت پیدا ہُوا تھا، آج بھی پیدا ہو رہا ہے۔ اس قانون کے مطابق انواع کے دُوسرے افراد کو بھی مسلسل ترقی کرتے رہنا چاہیے تھا۔ کیا اِرتقاء کے دائرے میں سائنس کے بنیادی قانون عِلّت اور لزوم کالعدم ہو گئے ہیں؟ مزید برآں سائنس کی دُنیا میں یہ الفاظ "کسی نامعلوم زمانہ میں، اِتفاقاً، ایک مرتبہ، خُود بخود" بیگانہ اور اجنبی نظر آتے ہیں۔ یہ الفاظ تو قِصّہ کہانیوں Fiction میں استعمال ہوتے ہیں۔

مسئلۂ اِرتقاء یہ بتاتا ہے کہ حیات نے ادنیٰ مظہر سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی ہے۔ فروتر سے برتر کی طرف ترقی کی ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اوّلین جرثومۂ حیات کو اپنی آخری منزل کا عِلم تھا۔ جب ہی تو حیات نے اپنا طویل سفر بخطِ مستقیم اعلیٰ کی طرف طے کیا۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ یہاں اوّل روز سے حِکمت و دانائی کی کارفرمائی رہی ہے۔ اندھی بہری فطرت میں یہ دانائی اور حکمت کا شعور کہاں سے پیدا ہو گیا؟ یہ بات تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہاں علیم و حکیم خداوند تعالیٰ کا دستِ قُدرت کارفرما رہا ہے۔ غیر معمولی علت جس

کو یہ سائنس داں بخت و اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں وہ درحقیقت صانع خلاق کی غیر معمولی مداخلت ہے۔ خداوند تعالیٰ کو خالق مانے بغیر تخلیق کی کوئی توجیہہ عقل و منطق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ حیاتیاتی سائنس دانوں کو ورثہ میں ملی ہوئی لادینی ذہنیت مانع آتی ہے کہ وہ اصل حقیقت کا برملا اعتراف کریں۔ ذہنی تعصب حقیقت کا ادراک کرنے اور اظہار کرنے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

ڈاروینی تحقیق کی حقیقت

ڈارون لکھتا ہے کہ میں اس فکر میں غلطاں تھا کہ معلوم کروں کہ کسی نوع حیوان کے افراد کی تعداد کیوں کم ہو جاتی ہے؟ کیوں وہ فنا ہو جاتی ہے؟ اس زمانہ میں مجھے مالتھوس کا نظریہ متعلق اضافۂ آبادی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ آبادی میں اضافہ تیزی سے ہوتا ہے لیکن خوراک اس تناسب سے افزوں نہیں ہوتی ہے۔ یہاں سے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ خوراک کے حصول کے لیے افراد انواع میں تصادم اور تنازع قائم رہتا ہے۔ اور خوراک کے عدم حصول کی وجہ سے کسی نوع میں کمی ہوتی ہے یا وہ فنا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح میں نے تنازع للبقا Struggle for existance. اور بقائے اصلح Survival of the fittest کے اصول اخذ کئے جو ارتقاء انواع میں کارفرما ہیں۔

یہاں اس سارے بیان کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کے قوانین دریافت کرنے کا کیا یہ معقول طریقہ ہے؟ کیا یہ سائنٹیفک تحقیق ہے؟ یہ تو اتفاق تھا کہ ڈارون نے اس زمانہ میں مالتھوس کا نظریہ آبادی پڑھا۔ وہ اگر اور کوئی نظریہ پڑھتا تو شاید اس کو چسپاں کر دیتا۔ یہ تو ایک اتفاقی حادثہ ہوا۔ تحقیق تو نہیں ہوئی۔ البتہ تنازع اور بقائے اصلح کے اصولوں نے کمزور قوموں

پر جو مظالم ڈھائے ہیں وہ بے حد و حساب ہیں۔ اب تک ساری قوموں میں مذاہب کی پھیلائی ہوئی یہ تعلیم تھی کہ افراد اقوام کے ساتھ اخلاق کے ساتھ اور ہمدردی کے ساتھ برتاؤ کرو۔ اب ڈارون کی تعلیم نے مارنے اور تباہ کرنے کے حیوانی جذبہ کو سند جواز عطا کر دی۔ اس کے بعد ہی انیسویں صدی کے مغربی انسان نے ایشیا اور افریقہ اور امریکہ کی اقوام کو خود غرضی کے جذبہ کے تحت نہایت بے دردی سے تباہ اور غارت کر دیا۔ بعض اقوام کی تو نسل ہی فنا کر دی۔ اور لطف یہ ہے کہ مسیحی ضمیر میں ادنیٰ سی خلش بھی محسوس نہیں ہوئی۔

۹- عقل کی تحقیر

جب انسان کو اعلیٰ درجہ کا حیوان قرار دے دیا گیا تو پھر عقلِ انسانی کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔ ڈارون نے دعویٰ کیا کہ عقلِ انسانی غذا تلاش کرنے کا ایک آلہ ہے بعض دوسرے لوگوں نے ذہن اور عقل کو دماغ کا اسی طرح ایک وظیفہ قرار دیا' جس طرح جگر کا وظیفہ صفرا پیدا کرنا ہے۔ جو لوگ عقل کو طبعی عوامل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ آخر اس امر کی کیا توجیہہ پیش کریں گے کہ عقل کی تحصیلات Achievements اور انکشافات Discoveries آفاقی اور عالم گیر ہیں۔ ایک فردِ واحد کے دماغ سے پیدا ہونے والا ریاضی کا قانون ساری دنیا میں نافذ العمل ہے۔ بلکہ قمر اور مریخ پر بھی قابلِ عمل ہے۔ اس میں آفاقیت کیوں ہے۔

۱۰- توانائی غیر فانی

ژول Joule, 1818-1889 (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ توانائی بھی کائنات میں غیر فانی ہے۔

۱۱- ذہنِ انسانی مادی

فرائڈ Freud, 1856-1939 (آسٹریا) نے ذہنِ انسانی کو غیر مادی ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتا ہے ذہنی کارکردگی دماغ کا ایسا ہی فعل ہے جس طرح

جگر کا فعل صفرا کی تولید ہے۔

۱۲- انسانی اعمال کا محرک جنسی جذبہ

فرائڈ نے دعویٰ کیا کہ انسانی اعمال کا محرک اوّل جذبۂ کشش جنسی اور جذبۂ شہوت ہے۔ اس نے انسانی زندگی کے تمام اعمال کی تشریح و توجیہ جنسی جذبہ سے کر ڈالی حتیٰ کہ معصوم بچے کا انگوٹھا چوسنا بھی اس کی نظر میں جذبۂ جنسی کا مظہر ہے۔ انسان کے اندر اس کو کوئی جذبۂ خیر نظر نہیں آتا۔ اس کے افکار نے آزاد شہوت رانی کی راہ ہموار کر دی۔ اس راہ کی بندشوں کو اس نے توڑ کر پھینک دیا۔ ازدواجی تعلقات میں بے وفائی اور خاندانی نظام میں ابتری اس کے بعد سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈارون نے انسان کو حیوان قرار دیا تھا۔ فرائڈ نے انسان کی شرم و حیا کا پردہ چاک کر دیا اور آزاد شہوت رانی کی اجازت دے دی۔ اس کے بڑے دُور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اخلاق کا جنازہ نکل گیا۔ معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں "تحلیل نفسی" Psycho-Analysis کے دُوسرے ماہرین نے فرائڈ کے نظریات سے برملا اختلاف کیا ہے۔ ینگ Jung. -1875 ایڈلر Adler, 1870-1935 اور فائف Fife سب نے فرائڈ کے نظریۂ شہوت کی مخالفت کی ہے۔ دورِ جدید کا ایک محقق روزن برگ، فرائڈ کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"آج سے ۵۰ سال قبل تو یہ (تحلیلِ نفسی) ایک ویران صحرا کی مانند تھی، جس میں چند منفرد معلومات کو لے کر فرائڈ نے اپنی نظریات سازی کی ہے۔ آخر عمر میں اُس نے ان نظریات پر نظر ثانی کی تھی اور یہ بات تسلیم کی تھی کہ جنسی جذبہ کے مقابلہ میں اثباتِ ذات کا جذبہ زیادہ قوی محرکِ عمل ہے[1]۔"

[1] Encyclopaedia of Medical Self Help, by Max. M. Rosenberg New York 1967 page 414

فنِ تحلیلِ نفسی کے متعلق وہ لکھتا ہے:

انیسویں صدی کے دُوسرے دانشوروں کی طرح فرائڈ نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے غلط طور پر یہ سمجھا کہ انسان، حیوان کی ہی ایک نوع ہے۔ وہ خصوصی تخلیق اور بلند تر مقاصد کی حامل جداگانہ نوع نہیں ہے۔ اس نے ہماری صحت کو ماہرِ تحلیلِ نفسی کی میز سے وابستہ کر دیا۔ لیکن آج بہت کم معالجین فرائڈ کے مزعومات کو اور اس کے افسانوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ نہ وہ اس کا طریقۂ کار ہی اختیار کرتے ہیں۔ آج کل کے نفسی معالجین بالراست طریقۂ علاج سے اور قوتِ ایمانی سے اعصابی مریضوں کو تندرست کر دیتے ہیں۔ اس کے اندر اپنی ذات پر اعتماد پیدا کرتے ہیں۔ اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ آج کل "اجتماعی معالجہ" Group Therapy اور "پیشہ ورانہ معالجہ" Occupational Therapy پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ زیادہ کوشش اس امر کی کی جاتی ہے کہ مریض کے اندر عزتِ نفس اور خودداری کے تصورات بیدار کر کے اس کو معاشرہ سے مربوط کر دیا جائے۔ بیسویں صدی کا یہ طریقۂ علاج انسان کے فطری اور جبلتی اعتقاد سے ہم آہنگ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق خاص ہے اور ہرگز حیوان نہیں ہے[1]۔"

۱۳- علوم و فنون و ادب جنسی جذبہ کی پیداوار

فرائڈ نے ایک عجیب و غریب دعویٰ یہ کیا کہ جنسی خواہشات کے اظہار پر مذہب، اخلاق اور معاشرہ نے

[1] Encyclopaedia of Medical Self Help, by Max. M. Rosenberg New York 1967 page 888

پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ ان محبوس خواہشات نے تلافی مافات کے طور پر مذہب، فلسفہ، ادب اور آرٹ کی تخلیق کی ہے۔ آج دنیا میں علم و ہنر کی ساری بہار محبوس جنسی جذبہ کی آبیاری کا نتیجہ ہے۔

یہاں فرائڈ عجیب منطقی تضاد کا مرتکب ہوا ہے۔ وہ پہلے تو مذہب و اخلاق کو مقدم مانتا ہے، جنھوں نے جنسی شہوات کے اظہار پر بندشیں عائد کی ہیں۔ دُوسری جانب ان محبوس خواہشات کا نتیجہ عمل مذہب و اخلاق و ادب کو قرار دیتا ہے۔ اس صورت میں مذہب و اخلاق و ادب مؤخر قرار پاتے ہیں۔ ایک ہی شے بیک وقت کیسے مقدم بھی ہو سکتی ہے اور مؤخر بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہے۔

تعجب خیز امر یہ ہے کہ فرائڈ کے متعلق "اکابر صیہونیت کے لائحۂ عمل" The Protocol of Learned Elders of Zion میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے:

"ہمیں غیر یہودیوں کے اخلاقی دیوالیہ پن کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ دُنیا پر ہماری حاکمیت مسلط ہو سکے۔ فرائڈ ہمارا ہے، اور وہ جنسی تعلقات کو کھلا کھلا اچھالتا رہے گا، تاکہ کوئی مقدس شے باقی نہ رہے، اور لوگوں کا کام صرف اپنی جنسی بھوک مٹانا رہ جائے۔ بس اس وقت اخلاق کا دیوالیہ نکل جائے گا۔ . . . . ڈارون، مارکس اور لطشہ کا پروگرام ہم نے مرتب کیا ہے۔ ہم ان افکار کی خوب خوب اشاعت کریں گے۔ ان علوم سے غیر یہودی فکر میں جو زوال پیدا ہوگا، وہ بالکل ظاہر ہے[1]۔"

---

[1] محمد قطب کی کتاب "الاسلام بین المادیۃ والاسلام" کا اُردو ترجمہ "اسلام اور جدید مادی افکار" مترجم ساجد الرحمٰن۔ لاہور۔ صفحہ نمبر ۱۰۸

اِس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈارون، فرائڈ، مارکس وغیرہ کے نظریات سائنسی تحقیقات نہیں ہیں، بلکہ یہودی سازشی ذہن کی سوچی سمجھی اسکیم ہے جو اس نے مذہب اور اخلاق کا دیوالیہ نکالنے اور غیر یہودی اقوام کو زوال آمادہ کرنے کے لیے تیار کی ہے۔ جو لوگ ان نظریات کی سائنس کے نام پر اشاعت کر رہے ہیں، وہ دراصل فریب خوردہ ہیں۔ اور صیہونی سازش کا آلۂ کار بن گئے ہیں۔

۱۴۔ مذہب کی تخلیق توہمات اور خرافات سے ہے

ڈر کھائم Durkheim، (فرانس) نے ۱۹۱۲ء میں دعویٰ کیا کہ مذہب کا آغاز "طوطمیت" Totemism کی خرافات اور توہمات سے ہوا ہے۔ خوف، خرافات، شرک و بت پرستی کے مختلف مراحل سے گزر کر توحیدی مذاہب کا وجود عمل میں آیا ہے۔ ڈر کھائم کے نظریات نے ان لوگوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی جو انسان کو حیوان قرار دے چکے تھے اور اس اُلجھن میں مبتلا ہو گئے تھے کہ آخر اس حیوان کو مذہب کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ مذہب کیسے پیدا ہوا؟

۱۵۔ ذہنی شعور کا اِنکار

واٹسن Watson, 1878-1958: (امریکہ) نے انسان کے ذہنی شعور کا انکار کر دیا۔ انسان کے جسمانی کردار کو ہی اصل ذہنی کردار قرار دیا۔ اس نے علمِ نفسیات میں ایک نئے دبستان ـــــ دبستانِ کرداریت ـــــ Behaviourism کی بنیاد ڈالی۔

عالمِ افکار

سائنس دانوں کی رَوِش کے قدم بہ قدم فلاسفہ اور مفکرین بھی لادینیت کی راہ پر چل پڑے۔ انھوں نے فکری زندگی کے دُور دراز گوشوں میں مذہب بیزاری

کی مہر کو دوڑا دیا۔ ان کی ذہنی کاوشوں اور نادر افکار سے ذیل میں ہم تعارف حاصل کرتے ہیں۔

Machiavelli, 1469-1532 میکیاویلی

۱۔ بے لگام سیاست

(اطالیہ) نے حکمرانوں کو مشورہ دیا کہ مذہب اور اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو کر سیاست کاری کریں۔ کسی اصول، ضابطہ اور عقیدہ کو حصولِ مقصد کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیں۔ اس دن سے کذب و بہتان اور مکر و فریب سیاست کاری کی اہم جزو قرار پاتے۔ بلکہ میکیاویلی سیاست کاری کے معنی ہی دھوکہ اور فریب کے ہو گئے ہیں۔

Thomas Hobes, 1588-1679 تھامس ہابز

۲۔ حکمران کو خدائی کا مرتبہ

(انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ حکمران کو اپنے ملک میں خدائی کا مرتبہ حاصل ہے۔ وہ انسانوں کے لیے ہر قسم کے قوانین معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی بنا سکتا ہے۔ مطلق العنانی اور کلیت پسندی Totalitarianism کی جانب ریاست کا یہ پہلا قدم تھا۔ مذہب کو ریاست کے تابع بنانے کی یہ اوّلین کوشش تھی۔

تھامس ہابز

۳۔ ریاستوں کے درمیان عناد اور رقابت

نے اپنی کتاب "لواتے تھان" Leviathan-1651 میں دعویٰ کیا کہ دو ریاستوں کے درمیان فطری رشتہ عناد اور رقابت کا ہے۔ اس کے بعد سے تین صدیاں گزر چکی ہیں، دنیا میں ہر جگہ ریاستوں کے درمیان جنگ و جدل کا بازار گرم ہے۔ تھک ہار کر اب بیسویں صدی میں ریاستوں کے سربراہ باہمی دوستی اور بقائے باہمی کے الفاظ دہرانے لگے ہیں۔

Descartes, 1597-1650 ڈیکارٹ

۴۔ وحیِ الٰہی کا انکار

(فرانس) نے عقل و حواس کے علاوہ علم حاصل

کرنے کے تمام دوسرے ذرائع کا انکار کر دیا۔ اس طرح وحیِ الٰہی کا بھی خود بخود انکار ہو گیا۔ اس کی زد براہِ راست مذاہب پر پڑی۔ مذہب کا ذریعۂ علم غیر مستند قرار پا گیا۔

کانٹ نے بعد میں عقل کی دیوی کو اس کے بلند استھان سے نیچے گرا دیا تھا۔ جہاں اسے ڈیکارٹ نے بٹھایا تھا، مگر انقلابِ فرانس کے رہنماؤں نے پھر دوبارہ اس کو بلند استھان پر براجمان کر دیا۔[1]

John Locke, 1632-1704 جان لاک

۵۔ حکمرانی سے مذہب کا اخراج

(انگلستان) نے حکومت کے دائرۂ کار سے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کو خارج قرار دے دیا۔

(فرانس) Voltaire, ۱۶۹۴/۱۷۷۸ والٹیئر

۶۔ ماضی کا انسان ناقص

نے دعویٰ کیا کہ ماضی میں انسان ناقص تھا۔ اب مستقبل میں انسان کامل بن جائے گا۔ اس طرح اس نے انبیائے کرام علیہم السلام کے ناقص ہونے کا بالواسطہ فتویٰ صادر کر دیا۔ مسیحی چرچ کا سب سے بڑا دشمن یہ شخص تھا۔

(فرانس) Rousseau, 1712-1778 روسو

۷۔ عوام کی حکمرانی

نے دعویٰ کیا کہ ملک کے حکمران دراصل عوام ہوتے ہیں۔ عوام کی رائے سب سے برتر و بالا ہے۔ اس کے بعد سے عوام شترِ بے مہار بنا دیے گئے۔ مذہب اور اخلاق سب عوام کی مرضی کے تابع بن کر رہ گئے۔ اس نے اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ سے لے کر عوام کے متلون ہاتھوں میں دے دیا۔

(جرمنی) Kant, 1724-1806 کانٹ

۸۔ مذہب سے عاری اخلاق

نے پہلی مرتبہ مذہب سے عاری اخلاقی اصولوں کا لائحۂ عمل پیش کیا، حالاں کہ اس وقت تک مذہب اور اخلاق کا باہمی

---

1. Philosophy of Kant. by Fredric, page 3

رشتہ غیر منفک سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اخلاق کے لیے مذہب کو نظر انداز کر کے اس کے لیے فلسفیانہ بنیادیں تجویز کیں۔

Malthus, 1766-1834 مالتھس

۹۔ خدا کی رزّاقیت کا انکار (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ روز افزوں بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کے لیے دنیا میں موجودہ وسائلِ رزق ناکافی ہو جائیں گے، اس لیے اس نے انسانی آبادی کو کم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس طرح بالواسطہ طور پر اس نے اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت کا انکار کر دیا۔

آبادی سے متعلق مالتھوس کا نظریہ اور اس کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ اس کو مرے ہوئے ڈیڑھ صدی گزر چکی ہے اور دنیا کی آبادی تقریباً آٹھ گنا بڑھ گئی ہے۔ مگر انسانیت بھوک سے ختم نہیں ہوئی اس لیے کہ غذائی وسائل بھی کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ڈایر Gwynne Dyer نے جھوٹے نبی False Prophet کے نام سے مالتھوس پر ایک کتاب لکھی ہے۔

Hegal, 1770-1831 ہیگل (جرمنی) نے دعویٰ

۱۰۔ عالمِ غیب کا انکار کیا کہ جو موجود ہے، بس وہی حقیقت ہے۔ اس نے عالمِ غیب کا انکار کر دیا۔ اس طرح عالمِ غیب سے متعلق مذہب کے عقائد بھی رد کر دیے گئے۔

Adam Smith, 1772-1823 آدم اسمتھ

۱۱۔ معاشیات سے مذہب کا اخراج

(انگلستان) نے معاشیات کے دائرۂ کار سے مذہب کو خارج قرار دے دیا۔

Jane Austin جین آسٹن

۱۲۔ قانون سازی سے مذہب کا اخراج 1775-1813 (انگلستان)

نے قانون سازی کے دائرہ سے مذہب کو خارج قرار دے دیا۔

Free Mason Lodge فرانس کے فری میسن لاج

۱۳۔ نظامِ حیات لادینی نے ۱۷۶۶ء میں سب سے پہلے لادینی طرزِ زندگی کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے انسانی معاملات سے مذہب کو خارج قرار دے دیا۔ اس کے حق میں خوب پروپیگنڈا کیا۔ اس سے متاثر ہو کر انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء کے بعد وہاں کے عوام نے اس نظریہ کو قبول کر لیا۔ Laicism-Secularism

مغربی طرزِ زندگی کا یہ اہم موڑ ہے۔ اس کے بعد مذہب کا دائرۂ کار ایک فرد کی ذاتی زندگی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ بتدریج لادینیت پر پہلے مغرب میں عوام کا پختہ یقین پیدا ہو گیا، اور پھر مغربی اقوام نے اس کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ آج درحقیقت مغرب کا بلکہ بیشتر دُنیا کا "مذہب" لادینیت ہے۔

August Comte, ۱۷۹۵/۱۸۵۷ آگسٹ کومٹے

۱۴۔ قوم خدا کا مظہر (فرانس) نے دعویٰ کیا کہ نوعِ انسانی کے وجود میں خُدا کا ظہور ہوا ہے۔

Feurbach, 1804-1872 فیورباخ (جرمنی)

۱۵۔ خدا کا انکار نے خداوند تعالیٰ کے وجود کا انکار کر دیا اور مذہب کو ایک کھلونا قرار دیا۔ "رُوحِ مسیحیت" Essence of Christianity لکھ کر اُس نے مذہب عیسائیت کی مکمل تردید اور تغلیط کی ہے۔

Stuart Mill, 1806-1873 اسٹوآرٹ مِل

۱۶۔ خیر و شر مادّی (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ جو نافع ہے، بس وہی خیر ہے۔ جو مضر ہے، بس وہی شر ہے۔ خیر و شر کوئی ابدی حقیقتیں نہیں ہیں جیسا کہ مذہب کا دعویٰ ہے۔

فریڈرخ اسٹراس Friedrich Strauss,

۱۷۔ حضرت عیسیٰ کے وجود کا اِنکار

1808-1874 (جرمنی) نے دعویٰ کیا کہ یسوع مسیح ایک فرضی انسان تھے۔

Bruno Bauer, 1809-1882 برونو بور

۱۸- انجیل اغلاط سے پُر (جرمنی) نے ثابت کیا کہ انجیل New Testament اغلاط سے پُر ہے، اِس لیے ناقابلِ اعتماد ہے۔

Holyake, 1817-1906 ہولیاک

۱۹- آخرت کا انکار (انگلستان) نے آخرت کا وجود ماننے سے انکار کر دیا۔

Karl Marx, 1818-1883 کارل مارکس

۲۰- بغیر خدا کارزارِ حیات (جرمنی) نے تاریخ کا مادی تصور پیش کیا کارزارِ حیات میں دستِ خداوندی کی کارفرمائی ماننے سے انکار کر دیا۔

۲۱- مذہب افیون کارل مارکس نے دعویٰ کیا کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے زیر دست اور مزدور طبقہ کو مذہب کی افیون کا نشہ دے کر بے خود بنائے رکھا تاکہ وہ اپنے حقوق کی جانب سے غافل رہے۔

کارل مارکس کا سارا فلسفہ ہیگل سے ماخوذ ہے۔ اس میں اس نے اپنے افکار کی پیوندکاری کی ہے۔ اِس سلسلہ میں برٹرانڈ رسل لکھتا ہے:

"مجمل طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مارکس کے فلسفہ کے وہ تمام عناصر جو ہیگل کے فلسفہ سے ماخوذ ہیں، وہ بالکل غیر سائنسی ہیں۔ اس معنی میں ان کو درست تصور کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ بحیثیت فلسفی مارکس میں بہت سی خامیاں ہیں۔[1]"

W. James, 1842-1910 ولیم جیمس

۲۲- صداقت کی آفاقی حیثیت کا انکار (امریکہ) نے

History of European Philosophy, by Bertrand Russell, page 816

"صداقت" کی معروضی اور بے لاگ حیثیت کا انکار کر دیا۔ بلکہ اس کو نفسِ انسانی کی ایک کیفیت قرار دیا۔ اس کے بعد سے صداقت Truth کی مستقل اور ابدی حیثیت ختم ہو گئی۔ اس کو زمان اور مکان کے لحاظ سے اضافی اور تغیر پذیر قرار دیا۔ اس کے بعد سے اخلاقی اصولوں کے لیے کوئی مثبت بنیاد باقی نہیں رہی اس کے بعد سے حق و صداقت کو حکمرانوں نے اپنے منشاء کے مطابق خوب مسخ کیا۔ اب مظلوم کے لیے حق کی آخری اپیل بھی ختم ہو گئی۔ اب ہر فریق حق و صداقت کا نام لیتا ہے، لیکن مشترک معروضی مفہوم متعین نہ ہونے کی وجہ سے حق و صداقت کے نام پر متضاد مطالبات پیش کرتا ہے۔

Nietzshe, 1844-1900 نطشہ (جرمنی) نے

۲۳- خدا کی موت دعویٰ کیا کہ خدا کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس نے مسیحیت کو غلاموں کا مذہب قرار دیا۔ اس طرح بتدریج اہلِ مغرب کے ہاتھوں مذہب، اخلاق اور روحانیت کی ردائے مقدس تار تار ہو گئی۔

John Dewy, 1859-1952 جان ڈیوی

۲۴- اخلاقی قدروں کا انکار (امریکہ) نے اخلاقی قدروں کا مستقل وجود ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہر انسان اپنے عمل سے ہر دم نئی قدریں وضع کرتا رہتا ہے۔

Paul Sartre, 1905-1980 پال سارتر (فرانس)

۲۵- خدا سے آزادی نے دعویٰ کیا کہ انسان کی آزادی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ وہ خدا، مذہب اور اخلاق سے آزادی حاصل نہ کر لے۔

Carnap, 1914- کارنپ (آسٹریا) نے

۲۶- غیر حسی صداقت کا انکار ہر اُس صداقت کا انکار کر دیا جس کو ہمارے حواس براہِ راست دریافت نہ کر سکیں۔ اس طرح عالمِ غیب سے متعلق

مذہبی عقائد کا اس نے صاف انکار کر دیا۔

عالمِ معاشرت

سائنس دانوں اور فلسفیوں سے متاثر ہو کر یورپ کے مسیحی معاشرہ میں ایسے "مصلحین" کا گروہ پیدا ہو گیا، جنھوں نے لادینی افکار و نظریات کے زیرِ اثر معاشرہ میں انقلاب انگیز تبدیلیاں پیدا کر ڈالیں اور مسیحی دَور کے تمام اثرات کو مٹا ڈالا۔ ان "اصلاحی" تبدیلیوں سے ذیل میں تعارف حاصل کرتے ہیں:

۱۔ دین و دنیا کی تفریق — یورپ کے سیاست دانوں نے "صُلح نامہ ویسٹ فیلیا" Treaty of West Phalia (24th Oct.1648) کے ذریعہ مذہبی اور دنیوی قوانین کی تفریق پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ وہاں یہ فارمولا طے پایا: "شاہی قانون ہی مذہبی قانون ہے۔" Cuis Regis Cius Religio اس دن کے بعد سے یورپ کے معاشرہ میں مذہبی قانون کو کارفرمائی کا حق نہیں رہا۔ یہ بات مسلّم ہو گئی۔

۲۔ عورتوں کے حقوق کی بحالی — والسٹن کرافٹ Wallstone Craft, 1759-1797 (انگلستان) نے خواتین کے حقوق کی بحالی کے لیے ۱۷۹۲ء میں ایک کتاب لکھی۔ اس نے عورتوں کی مظلومیت کو بڑے زوردار طریقہ سے پیش کیا۔ اس نے ان کے حقوق کے حق میں زبردست تحریک چلائی۔

۳۔ وطن پرستی — فِکٹے Fichte, 1762-1814 (جرمنی) نے سب سے پہلے جرمن قوم کو وطن پرستی کی طرف دعوت دی۔ اب تک صرف حق پرستی کی طرف دعوت دی جاتی تھی۔ اس کے بعد سے وحدتِ الٰہ اور اخوتِ انسانی کے تصورات متروک ہو گئے۔

۴۔ ضبطِ ولادت — مالتھس Malthus, 1766-1834 (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ دُنیا میں انسانوں کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اور غذا کا ذخیرہ محدود ہے۔ اس لیے مستقبل میں افلاس اور قحط انسان کا مقدر بن چکا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ضبطِ ولادت پر عمل کر کے آبادی کی تعداد کم کی جائے۔ اس کے بعد سے منعِ حمل کے لیے نئے نئے طریقے سوچے جانے لگے۔ اور قومی فلاح سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونے کی مختلف ڈھنگ سے ترغیب دی جانے لگی۔ اس سے جنسی آوارگی، فحاشی اور بے راہ روی کا راستہ کھُل گیا۔ کل جو فعل معیوب تھا، اب وہ معیوب نہ رہا۔

۵۔ قانون خوشنودیٔ قوم — انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء French Revolution کے دوران میں "حقوقِ انسانی" کے ذریعہ اس امر کا اعلان کیا گیا کہ ملکی قانون عوام کی رضامندی کا نام ہے۔ اس کے بعد سے قانون میں سے معیاریت Normativeness کا عنصر حذف ہو گیا۔ تقدس اور نتیجۃً استحکام کا عنصر بھی مفقود ہو گیا۔ اب قانون عوام کے مزاج کے مطابق تلوّن مزاجی کا شکار ہو گیا۔

۶۔ ریاست قابلِ پرستش — ہیگل Hegel, 1770-1831 (جرمنی) نے دعویٰ کیا کہ ریاست کے وجود میں خدا کا ظہور ہوا ہے۔ اس لیے انسانوں کو چاہیے کہ وہ ریاست کی پرستش کریں۔

۷۔ قوم مظہرِ خدا — گوسپ مازنی Guiseppe Mazzini, 1805-1873 (اطالیہ) نے دعویٰ کیا کہ قوم کے وجود میں خُداوند تعالیٰ کا ظہور ہوا ہے، اس لیے قوم کی پرستش کرنا چاہیے۔ مازنی اتحادِ اطالیہ کا زبردست داعی تھا۔ اس کے افکار سے قوم پرستی کی تحریک کو ساری دُنیا میں غیر معمولی تقویت پہنچی ہے۔

۸- عورت شمعِ محفل — اسٹوارٹ مِل Stuart Mill, 1806-1873 (انگلستان) نے عورت اور مرد کی کامل مساوات کا نعرہ بلند کیا اور خواتین کو خانگی زندگی سے باہر نکالنے پر زور دیا۔

۹- نسل پرستی — گوبلنو Gobineau, 1816-1862 (فرانس) نے نسلی برتری اور تفاخر کا دعویٰ کیا۔ ساری دُنیا میں سفید فام نسل اعلیٰ ہے۔ اس کے اندر نارڈک Nordic نسل سب سے ہی برتر اور اعلیٰ تر ہے۔

۱۰- ہم جنسی شہوت رانی کا جواز — تھامس مین Thomas Mann, 1875-1955 اور ھرش فیلڈ Hersch Field (جرمنی) نے ہم جنسی اختلاط کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا۔ جس سے سارا مغربی معاشرہ متاثر ہوا ہے۔ حتیٰ کہ حال ہی میں انگلستان کے سب سے بڑے مذہبی رہنما آرک بشپ آف کنٹربری Arch Bishop of Canterbury نے بھی اس فعلِ قبیح کے جواز کا فتویٰ صادر کر دیا ہے۔

۱۱- الحاد کی تبلیغ — بریڈلا Breadlaugh, 1833-1891 (انگلستان) نے یورپ میں سب سے پہلے الحاد اور دہریت کی تبلیغ کے لیے باقاعدہ منظم کوشش کی۔ رُوس میں "انجمن عدو اللہ" Anti-god Society کا قیام اس کے بہت بعد ۱۹۳۴ء میں عمل میں آیا ہے۔ لاہور کا بریڈلا ھال اسی کی جانب منسوب ہے۔

۱۲- خواتین کی آوارگی — جیکسن بلیک Jackson Blake, 1840-1912 (انگلستان) نے عورتوں کو جنسی معاملات میں قیود و بندش توڑنے اور آزادانہ رَوِش اختیار کرنے کی تلقین کی۔

۱۳- قوم پرستی دینِ مغرب — صلح نامہ وارسائی (فرانس) ۲۸ جون ۱۹۱۹ء Treaty of Versailles کے بعد سے قوم پرستی جدید یورپ کا تسلیم شدہ مذہب قرار پا گئی۔ قوم پرستی کے بعد سے قومی عناد، اکثریت و اقلیت کی جنگ اور اجتماعی ہجرت کے جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ جو پہلے نہیں تھے۔

۱۴- صرف مزدور مقتدرِ اعلیٰ — لینن Lenin, 1870-1924 (رُوس) نے دعویٰ کیا کہ اقتدارِ اعلیٰ کے حامل سارے عوام نہیں ہیں، بلکہ صرف محنت کش طبقہ ہے، مزدور حکمران ہیں، دُوسرے ان کے محکوم ہیں۔

۱۵- قومیتوں کا تصوّر — لینن نے دعویٰ کیا کہ ملک کے اندر اکائی قوم نہیں ہے، بلکہ قومیتیں ہیں۔ کئی قومیتوں سے مل کر ایک قوم بنتی ہے۔ اُس نے استحصالی اغراض کے لیے محکوم اقوام کو مزید ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر ڈالا۔

عالمِ اَدبیات

ادبیات کے آئینہ میں قومی افکار و خیالات، آرزوئیں، اور تمنائیں عکس ریز ہوتی ہیں۔ کسی قوم اور ملک کے حقیقی افکار و احساسات کی صحیح تصویر اس کے ادبیات میں نظر آتی ہے۔ مغربی اقوام کا ادب ان کے حقیقی افکار کا آئینہ دار ہے۔ اس ادب نے جو کردار پیش کیے ہیں۔ جنہوں نے قبولیت عامہ حاصل کر لی ہے، وہ دراصل مغربی اقوام کے انسان مطلوب ہیں۔ ان کرداروں میں مغرب کا معیارِ خیر و شر جھلکتا ہے۔ ان کا تذکرہ کرنا بر محل ہو گا۔

۱- پرومیتھین Promethean

یہ تخیل یونانی ادب سے ماخوذ ہے۔ اور ایک غیر ذمہ دار کھلنڈرے انسان

کا کردار ہے۔

۲۔ فرینکنسٹائن Frankenstein

تخلیق — ماری شیلے Mary Shelley 1818

یہ تخریب کاری کا دیوتا ہے۔

۳۔ فاؤسٹ Faust

تخلیق — گوئٹے Goethe, 1749-1832 (جرمنی)

یہ جرمن جادوگر ہے جو خواہشاتِ نفسانی میں غرق ہے۔

۴۔ اوڈی پس Odepus

تخلیق — فرائڈ Freud, 1856-1939 (آسٹریا)

ایسا بیٹا جو اپنی ماں پر نظرِ بد رکھتا ہے۔

۵۔ لیکٹرا Lectra

تخلیق — فرائڈ

ایسی بیٹی جو اپنے باپ پر نظرِ بد رکھتی ہے۔

نشۂ پندار کے دعوے

لادینی فتوحات کی صہبائے تند و تیز نے ہر سائنس داں اور ہر مفکر کو بے خود بنا دیا تھا۔ ہر شخص دُنیا میں جنت تعمیر کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ہر شخص مستقبل بینی اور پیش گوئی کا ماہر بن گیا تھا۔ ایسی دو چار ترنگیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ دنیا جنت بن جائے گی فرانسس بیکن Francis Bacon, 1561-1626 (انگلستان) نے دعویٰ کیا تھا کہ جب سائنس کو مذہب پر غلبہ حاصل ہو جائے گا، تب یہ دُنیا جنتِ ارضی میں تبدیل ہو جائے گی۔

آج سائنس کو مکمل غلبہ ہے، مگر آج کا انسان جتنا طمانیتِ قلب سے محروم

ہے، اتنا محروم تاریخ کے کسی دَور میں وہ نہیں ہوا تھا۔

۲۔ ظلم کا خاتمہ والٹیئر Voltaire, 1696-1778 (فرانس) نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر مذہبی خیالات ذہنِ انسانی سے کھرچ کر پھینک دیے جائیں تو دُنیا سے تنگ نظری اور ظلم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آج کا یورپ مکمل طور پر لامذہب بن چکا ہے، مگر تنگ نظری اور ظلم میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۳۔ کائنات کا راز سائمن لاپلاس Simon Laplace, 1794-1837 (فرانس) نے سائنس کی کامیابی کے نشہ سے بدمست ہو کر دعویٰ کیا تھا کہ نیوٹن نے کائنات کی میکانکس Mechanics دریافت کر لی ہے۔ اب یہ بات ممکن ہو گئی ہے کہ کائنات کا ماضی اور اس کا مستقبل معلوم ہو جائے۔ لیکن آج کے سائنس داں اس قسم کے دعویٰ سے گریز کرتے ہیں۔

۴۔ دُنیا جنتِ ارضی کارل مارکس Karl Marx, 1818-1883 (جرمنی) نے دعویٰ کیا تھا کہ جب دُنیا سے سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا تو یہ دُنیا جنتِ ارضی میں تبدیل ہو جائے گی۔ رُوس میں نصف صدی سے ایسا نظام نافذ ہے جس میں سرمایہ داری کا خاتمہ ہو چکا ہے، لیکن ہر سال سینکڑوں لوگ اس جنتِ ارضی سے فرار ہو کر سرمایہ دار ملکوں میں جاتے رہتے ہیں۔ تیس سال تک سوشلزم کا مزہ چکھنے کے بعد حال ہی میں چین دوبارہ سرمایہ داری کی راہ پر چل پڑا ہے۔

۵۔ تخلیق پر قادر ارنسٹ ہیکل Earnest Haeckel, (جرمنی) نے دعویٰ کیا تھا کہ ڈارون نے اسرارِ حیات معلوم کر لیے ہیں۔ اگر مناسب کیمیاوی اجزا اور مناسب مدت اس کو مہیا کر دی جاتی تو وہ بھی انسان کی تخلیق کر سکتا تھا۔ مسئلہ ارتقاء کی دریافت کو سوا سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، آج تک تو کوئی سائنس داں تخلیق کے میدان میں کامیاب ہوا نہیں۔ بلکہ خود ڈارونیت میں آئے دن پیوند کاری کرنا پڑ رہی ہے۔

۶۔ ذہنی سکون و طمانیت

Sigmund Freud, 1856-1939 سگمنڈ فرائڈ (آسٹریا) نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر نفس کو شہوت کے اظہار اور تسکین کی مکمل آزادی حاصل ہو جائے تو پھر انسان کو کامل ذہنی سکون اور طمانیت حاصل ہو جائے گی۔ آج کل یورپ میں برہنہ باڑے Nudist Club بھی موجود ہیں اور ننگے جوڑے بھی سر بازار پھرتے رہتے ہیں۔ ان کو مادر پدر آزادی حاصل ہے، مگر دل کا سکون اور چین پھر بھی ناپید ہے۔

۷۔ مصائب کا خاتمہ

برٹرینڈ رسل Bertrand Russel, (انگلستان) نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر قدامت پرستی اور توہم پرستی کا خاتمہ ہو جائے اور عقل کو انسانی معاملات میں مکمل بالادستی حاصل ہو جائے تو دُنیا سے مصائب اور آلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یورپ اور امریکہ کی الٹرا ماڈرن سوسائٹی Ultra Modern Society میں مندرجہ بالا شرائط پوری طرح پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ بات عام معلوم ہے کہ وہاں بھی مصائب اور آلام کا خاتمہ نہ ہو سکا۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

۸۔ جنگوں کا خاتمہ

مسلکِ لادینیت پیش کرنے والوں نے سب سے وزنی دلیل یہ پیش کی تھی کہ جنگیں اور خونریزی مذہب کی وجہ سے برپا ہوتی ہیں۔ اگر مذہب کو سیاست اور اجتماعی معاملات سے بے دخل کر دیا جائے اور مسلکِ لادینیت کو اختیار کر لیا جائے تو دُنیا سے ہمیشہ کے لیے جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا، اور انسان امن و سکون کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرے گا۔ اس دل خوش کن وعدہ کی وجہ سے ہی عوام نے مذہبیت کو ترک کر دیا اور لادینیت کو قبول کر لیا۔ اٹھارھویں، انیسویں صدی کے تقریباً تمام سائنس دان، فلاسفر، سیاست دان اور مفکرین اس خیال کے حامی تھے۔

بیسویں صدی میں جب سائنس کی قوتیں اور مسلکِ لادینیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو گئے، تب دُنیا نے دیکھا کہ سائنس کے زیرِ اثر جنگیں، سابق کی جنگوں سے کہیں زیادہ تباہ کن اور بھیانک ہیں۔ بقول پروفیسر سوروکن:

"گیارھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک تمام جنگوں میں مجموعی طور پر کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی قتل ہوئے اور زخمی ہوئے، لیکن دُنیا میں پہلی جنگِ عظیم میں کوئی دو لاکھ انسان ہلاک ہو گئے، اور جنگِ عظیم دوم میں تو صرف ایک شہر ہیروشیما میں دو لاکھ آدمی ہلاک اور ناکارہ بنا دیے گئے۔ دُوسری جنگِ عظیم میں ہلاک شدگان کی تعداد پچاس لاکھ سے زائد تھی۔[1]"

دنیا میں آدم کشی کی تیاری یعنی اسلحہ سازی کی دوڑ اتنے بڑے پیمانہ پر پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جتنی اب سائنس کی ترقی اور مسلکِ لادینیت کے زیرِ سایہ ہو رہی ہے۔ دُنیا میں کھربوں روپیہ اس "کارِ خیر" پر صرف ہو رہا ہے۔ جس امن و سکون کا وعدہ آغاز میں کیا گیا تھا، اس کا دُور دُور تک کہیں پتہ نہیں ہے۔

صدائے تنبیہہ

اسی زمانہ میں چند حکماء اور فلاسفہ ایسے بھی ہوئے جنھوں نے حسیت Sensism اور مادیت Materialism کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کی کوشش کی۔ انھوں نے معروف علمی طریقہ سے کچھ ایسے حقائق کا اثبات کیا جو لادینی رُجحان کے مخالف تھے۔ ان حکماء کی صداقت مسلّم تھی۔ کوئی شخص آج تک ان حقائق کی تردید بھی نہیں کر سکا۔ لیکن سائنس کی رَو لادینیت کی راہ پر چل رہی تھی۔ سائنس دان اپنی کامیابی کے نشہ میں اتنے مخمور تھے کہ وہ کسی مخالف

---

[1] Reconstruction of Man, by Prof Sorokin, page 104

آواز کو سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز دب کر رہ گئی۔ لادینیت کا کارواں بدستور رواں دواں بڑھتا چلا گیا۔ بہرکیف ان حقیقت پسند فلسفیوں کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

Bishop Berkley,
1685-1753 بشپ برکلے

۱۔ مادہ کا وجود ثابت نہیں (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ ذہنِ انسانی سے خارج کسی شے کا وجود ثابت نہیں ہے۔ اصل شے ذہن ہے۔ اپنے ذہن کے علاوہ ہم کسی دوسری شے سے واقف نہیں۔ اس لیے مادیت محتاجِ ثبوت ہے۔

David Hume,
1711-1776 ڈیوڈ ہیوم

۲۔ علت و معلول میں لزوم نہیں (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ علت اور معلول کے درمیان نہ لزوم ہے نہ جبر۔ ظاہر ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے کے بعد سائنس کی عمارت میں زلزلہ پڑ جاتا ہے۔ فرانس کے مشہور فلسفی ارنسٹ رینان Earnes Renan, 1832-1892 نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہیوم نے وہی کچھ کہا ہے جو اس سے قبل امام غزالی (۱۰۵۸ء تا ۱۱۱۱ء) کہہ چکے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے ایک بڑے سائنس داں آئن سٹائن کے نظریات سے ہیوم کا دعویٰ صحیح ثابت ہوجاتا ہے۔

عمانوئیل کانٹ Emmanual Kant, (جرمنی)

۳۔ عقل کی نارسائی نے ثابت کیا کہ عقلِ انسانی کا دائرۂ کار مادی حقائق ہیں۔ ماورائے مادہ عقل کی پرواز نہیں ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ مذہبی معتقدات اور عالمِ غیب کی باتوں کی تردید کرنا عقلاً درست نہیں ہے۔

لادینی تحریک کے نتائج

مسلکِ لادینیت کو قبولیت عامہ حاصل ہوجانے کے بعد اور سائنٹفک افکار کو غلبہ حاصل ہوجانے کے بعد یورپ میں ایک نئے انسان نے اور ایک نئے معاشرہ نے جنم لیا۔ قدیم مسیحی دور کے معتقدات، اخلاقی معیارات اور اقدارِ حیات کا چلن ختم ہوگیا۔ اب تعقل پسندی Rationalism نے مسیحی کلیسا کی تحکم پسندی Dogmatism کی جگہ لے لی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ تعقل پسندی بھی زیرِ ہدف آگئی۔ عقلیت پرستی کے خلاف کئی تحریکیں صف آراء ہوگئیں۔ معقولیت کے لیے کوئی سند اور معیار باقی نہیں رہا۔ پھر "جبلتوں" Instincts کے مسلک کو فروغ حاصل ہوا۔ انسان جبلتوں، طبعی خواہشات اور حیوانی خصائص کا نام رہ گیا۔ انسانی زندگی میں اخلاقی رفعت اور معیاریت Nor mativeism مطلوب ہونے کے بجائے اب واقعیت پسندی Realism کے نام پر حیوانی طرزِ عمل اپنانے کا نام ہے۔ اخلاقی قدروں کی ایجابی حیثیت ختم ہوگئی۔ اب ان کی حیثیت ناصحانہ مشورہ کی رہ گئی۔ غرضیکہ اس نئے دور میں حیوانیت ہر طرح فربہ اور تنومند ہوگئی اور انسانیت ناتواں تقریباً مفقود الخبر ہوگئی۔

فلسفۂ لادینیت اور مادیت کے تحت انسان غیر ذمہ دار اور خود غرض بن گیا ہے۔ اس کو کسی بالاتر ہستی کا یقین نہ رہا۔ آخرت میں اعمال کی جواب دہی کا یقین نہ رہا۔ کسی ضابطۂ ہدایت پر جو سب کے نزدیک مسلّم ہو، یقین نہ رہا۔ وہ خود مختار ہے۔ شترِ بے مہار ہے۔ اپنی عقل و فہم کو رہنمائی کے لیے کافی سمجھتا ہے۔ تکمیل خواہشات کے راستہ میں کسی نوع کی رکاوٹ یا اندیشہ کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔

ریاستی سطح پر

اپنے اقتدار کے راستہ میں اگر کسی فرد یا قوم کو رکاوٹ پاتا ہے تو مغرب کا

مہذب انسان ایک وحشی سے بھی بدترین جاتا ہے۔ پھر اس کی نگاہ میں انسان کی قدر و قیمت مکھی اور مچھر سے زیادہ نہیں رہتی۔ پھر اس کی تباہی اور غارتگری سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اقتدار حاصل کر لینے کے بعد یورپ کی اینگلو سیکسن اور سلاف اقوام نے دُنیا میں غیر اقوام کے ساتھ جو ظالمانہ، بہیمانہ اور درندگی کا سلوک روا رکھا ہے وہ اس ذہنیت کی بہترین وضاحت کرتا ہے۔

سفید فامیت اور نسلی تفاخر کے جذبہ کے تحت ہسپانوی اور پرتگالی اقوام نے امریکہ کے ہندوتے احمر Red Indians کو بندوقوں سے شکار کر کے فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ میکیکو Mexico اور پیرو Peru کی اقوام اور ان کے شاندار تہذیب و تمدن کا نام و نشان مٹا ڈالا۔ انگریز قوم نے آسٹریلیا، تسمانیہ اور نیوزی لینڈ کی قدیم نسلوں کو ہلاک کر ڈالا۔ آج وہاں ماؤری Maori نسل کا بیج تک باقی نہیں رہا۔ مہذب انگریز تاجر اور تاجیریا سے لاکھوں حبشیوں کو جانوروں کی طرح بندوقوں سے شکار کرتے تھے، پھر ان کو جہازوں میں بند کر کے محنت و مشقت کرنے کے لیے امریکہ لے جاتے تھے۔ امریکہ میں ان کو زنجیروں میں مقید رکھا جاتا تھا۔ نافرمانی کرنے پر ہر فرد کو حق حاصل تھا کہ وہ ان کو سنگسار Lynch کر دے۔

رُوسیوں نے انقلاب کے بعد کتنے ہی ترک قبائل کو ان کے گھروں سے اُکھاڑ کر سائبیریا کے برفستانوں میں پہنچا دیا، جہاں وہ ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے ہٹلر نے لاکھوں یہودیوں کو دخانی کال کوٹھریوں Gas Chambers میں پھینک دیا۔ جہاں چھ فٹ کا آدمی تین فٹ کا بونا بن جاتا تھا۔ ان کی ہڈیاں پیس کر کھیتوں کے لیے کھاد تیار کی جاتی تھی۔ ان کی چربی سے صابن تیار کیا جاتا تھا۔ امریکہ کے صدر روزویلٹ نے یالٹا کانفرنس Yalta Conference, 3rd Feb. 1945 میں اپنے حلیفوں چرچل اور اسٹالن سے ایٹم بم استعمال کرنے کا مشورہ طلب کیا اور اس کی غیر معمولی ہلاکت خیزیوں کا ذکر کیا۔ اسٹالن

نے جواباً کہا، "میں نے رُوس میں اجتماعی کاشت کاری Kolkhoz کی اسکیم نافذ کرنے میں لاکھوں افراد کو قتل کرا دیا، حالانکہ وہ امن کا زمانہ تھا۔ اب تو جنگ کا زمانہ ہے، اس ہلاکت خیزی سے کیوں گھبراتے ہو۔" جنوبی افریقہ اور رہوڈیشیا کی سفید فام اقلیتی حکومتوں نے اپنے سیاہ فام اکثریتی باشندوں کو آج بھی شہر سے باہر جانوروں کی طرح باڑوں میں رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ بلکہ ہر ملک میں اکثریت اقلیت کو معدوم کرنے یا فنا کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ یہ سب شجرِ لادینیت اور انکارِ آخرت کے کڑوے پھل ہیں۔ انسان انسان کے لیے درندہ بن گیا ہے ؎

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

انفرادی سطح پر

اِنفرادی سطح پر مغربی معاشرہ کا ہر فرد رُوحانی خلا میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی کسک وہ ہر لمحہ محسوس کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں ٹھیراؤ اور توازن نہیں رہا۔ وُہ انتہا پسندی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ ہر دم تحرک کے فلسفہ سے در اصل وہ ذہنی خلش کو فراموش کرنا چاہتا ہے۔ کبھی تو وہ ایسی دُون کی لیتا ہے کہ مذہب اور خدا سب کا انکار بر ملا کر ڈالتا ہے، کبھی اتنا نیچے گرتا ہے کہ مذہب کے نام پر بھونڈی شکلیں ——— جادُو، ٹونا، ٹوٹکا، توہم پرستی، مذہبی منڈلی جیسے "ہرے کرشنا" پر ایمان لے آتا ہے۔

اس کی زندگی مسلسل بے چینی کی المناک داستان ہے۔ اس کے متعلق دَورِ حاضر کا مفکرِ سائنس داں لی کومٹ Le Comte لکھتا ہے:

"اب اِس بات پر یقین ہو گیا ہے کہ موجودہ دَور کی بے چینی خاص طور پر اِس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ عقل نے سائنس کے نام پر جو ابھی تک گہوارۂ اطفال میں ہے، ابھی تک بلوغت کو نہیں پہنچا ——— انسانو

کو زندہ رہنے کے لیے ہر قسم کی اُمنگ اور معقولیت سے محروم کر دیا۔
اس نظریۂ حیات کو ــــ مذہب کو ــــ ہی ختم کر ڈالا جو ابھی تک زندگی کا مفہوم متعین کرتا تھا، جو جد و جہد میں حصّہ لینے کے لیے انسان کو اُبھارتا تھا، جو مادیت سے مافوق ایک بلند نصب العین عطا کرتا تھا؎۱"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

"انسانی زندگی میں اختیار کا انکار کر دینا، اخلاقی ذمّہ داری کا انکار کر دینا، حقیقتِ انسان کا تصوّر ایک طبعی کیمیائی مرکب کے طور پر پیش کرنا، جو کسی دُوسرے حیوانوں سے ممتاز نہیں ہے۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں اخلاقِ انسانی کو موت آگئی، رُوحانیت دم توڑ گئی، اُمید ختم ہو گئی، دُنیا میں بے کار محض ہونے کے تصوّرِ جانکاہ نے ذہنوں پر غلبہ حاصل کر لیا؎۲"

ایک اور جدید مصنف اس صُورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہُوئے لکھتا ہے:

"آج لاکھوں افراد بے چینی سے ڈھونڈ رہے ہیں، تلاش کر رہے ہیں، مگر کیا؟ یہ بات خُود انھیں بھی معلوم نہیں۔ جدید تعلیم، حق و باطل میں کسی تمیز کا باقی نہ رہنا، دُنیا کے عمل میں دوہرے معیارِ اخلاق کا پایا جانا، تجرباتی نفسیات، تجرباتی شہوت رانی، عدمِ ایمان، عدمِ تحفظ، جرائم کی کثرت، وافر فراغت و دولت، یہ خیال کہ بس طاقت ہی حق ہے اور دُوسرا کوئی معیارِ حق موجود نہیں ہے ان تمام عوامل نے مل کر موجودہ دور میں شکست فریب خوردگی، بداخلاقی، معاشرہ کے خلاف بغاوت اور زندگی سے فرار کو جنم دیا ہے؎۳"

اس نے امریکہ کے متمدن ترین معاشرہ میں ہپیوں کو جنم دیا ہے۔ مزید وہ

؎۱ ؎۲ Human Destiny, by Le-Comte De Nuavy, page 13

؎۳ Hippies, Hypocracy and Happiness, by Ambasador College

لکھتا ہے:

"ہپی Hippy دل سے یقین رکھتے ہیں کہ یہ دُنیا ایک سڑی ہُوئی جگہ ہے۔ ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے وہ دُنیا سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ اس کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں اور اس سے دُور بھاگتے ہیں؎۱"

مغربی معاشرہ میں حیوان تو موجود ہے لیکن انسان مفقود ہو گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہُوئے ایرک فروم Erich Fromme کا ایک چُبھتا ہُوا جملہ سننے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے: "انیسویں صدی کا مسئلہ یہ تھا کہ 'خدا مر گیا'، لیکن اب بیسویں صدی کا مسئلہ یہ ہے کہ 'انسان بھی مر گیا'۔" دُنیا کے سب سے بڑے مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی Arnold Toyanbee نے جدید مغربی تہذیب کے زوال کا مرض اس طرح تشخیص کیا ہے:

"خُود ساختہ زخم جن سے تہذیبیں مر جاتی ہیں، عام طور پر وہ مادّی نوعیت کے نہیں ہوتے ہیں، ماضی میں یہ زخم سب کے سب رُوحانی تھے۔ جو بالآخر ناقابلِ علاج ثابت ہُوئے۔"

چودہ سو سال قبل قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے لادینیت کے مرض اور اخلاق کے روگ سے اپنے بندوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ انھیں متنبہ کر دیا تھا کہ خدا فراموشی کا نتیجہ ہمیشہ خُود فراموشی اور بہیمیت کی صُورت میں ظاہر ہوتا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ۝ (سُورۂ حشر)

"ان انسانوں جیسا مت بن جانا جنھوں نے خدا فراموشی (خدا کے خلاف بغاوت) اختیار کی، (جس کی پاداش میں) اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر خُود فراموشی طاری کر دی (یعنی وہ انسانیت کو چھوڑ کر حیوانیت کی راہ

؎۱ California (U.S.A.) page 10 - 13

پر چل پڑے) جس کے بعد وہ فسق و فجور میں غرق ہو گئے۔"

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ، وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (زخرف)

"جو شخص رحمان کی یاد سے غفلت برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، اور وہ اس کا رفیق کار بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روک دیتے ہیں اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم ٹھیک راستہ پر چل رہے ہیں۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں : ؎

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد
زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
مشکلات حضرت انساں از وست
آدمیت را غمِ پنہاں از وست

آہ از افرنگ و از آئینِ او
آہ از اندیشۂ لادینِ او
علمِ حق را ساحری آموختند
ساحری نے کافری آموختند

علامہ اقبال

چوتھا باب

لادینیت کا فکری نظام

خدا اور آخرت کا انکار

اللہ، انسان اور آخرت، انسانی زندگی کی اہم حقیقتیں ہیں۔ فکرِ انسانی کی یہ تین اکائیاں ہیں۔ ان کے متعلق رائے قائم کیے بغیر انسان کے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ خواہ یہ خیال آرائی بچکانہ ہو، دیومالا کے افسانے ہوں، فلسفیانہ افکار ہوں، مثبت ہوں یا منفی ہوں۔ یہی خیال آرائی یا افکار کا مجموعہ کسی قوم کا نظامِ تصوّرات Idealogy کہلاتا ہے۔

کسی قوم کے نظامِ حیات کی تعمیر اس کے نظامِ تصورات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ مغرب میں نظامِ حیات کی عمارت مغربی تصوّرات اور افکار کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے۔ ان افکار و خیالات کی اہمیت انسانی زندگی میں بہت زیادہ ہے۔ اہلِ مغرب نے لادینی تحریک کے زیرِ اثر خدا اور آخرت کا انکار کر ڈالا۔ اس نے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بُری طرح مجروح کر دیا۔ انفرادی کردار اور باہمی روابط دونوں عدم استحکام اور عدم توازن کا شکار ہو گئے۔ اس کے بعد اخلاقی زندگی کے لیے کوئی بساط باقی نہیں رہی۔ عالمِ غیب اور غیر حسی حقیقتوں کا انکار کر دینے کے بعد اغراض و خواہشات، نمود و نمائش ان کے فکر و خیال کا محور بن گئے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خدا اور آخرت ایسی حقیقتیں ہیں جن کا تعلق مادّی دُنیا سے نہیں ہے بلکہ عالمِ ماورائے طبعیات سے ہے۔ تعقل و ادراک کی جو قوتیں انسان کو ودیعت کی گئی ہیں، وہ سب مادی الاصل ہیں۔ عالمِ غیب

یا عالمِ ماورائے طبیعیات عقلِ انسانی کی جولان گاہ نہیں ہے۔ ایک سائنس داں اور ایک فلسفی دونوں کا ذریعہ علم و تحقیق عقل ہے۔ ان کے پاس وہ مواد Data موجود نہیں ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ حقائقِ ماورائے طبیعیات کے متعلق کوئی حکم لگا سکیں، خواہ مثبت ہو یا منفی۔ وہ بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس ان امور کے دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ وہ لاادریہ Agnostic بن سکتے ہیں لیکن دہریہ Atheist نہیں بن سکتے، اس لیے کہ کسی شے کا انکار کرنے سے قبل اس کا علم ہونا ضروری ہے۔ جس چیز کا علم ہی ممکن نہیں ہے۔ اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ کسی شے کے متعلق لاعلمی کے معنی ہرگز یہ نہیں ہوتے کہ اس شے کا وجود نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ٹوکیو شہر کے نام سے واقف نہیں ہیں، لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ٹوکیو شہر کا وجود بھی نہیں ہے۔

اہلِ مغرب نے خدا، آخرت اور روحانیت کے متعلق جو منکرانہ نظریات پھیلائے ہیں، وہ سب بے بنیاد ہیں۔ ان کا انداز غیر علمی ہے۔ انھوں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے۔ ان کی یہ جسارت خود عقل کے خلاف ہے۔ اس طرزِ عمل سے نفس میں پوشیدہ مذہب بیزاری Theophobia کے جذبہ کی تسکین تو ہو گئی، لیکن اس طرح انھوں نے عقلیت پرستی کے خود قائم کردہ اصولوں کی قطعی نفی کر ڈالی۔ اس غلط اقدام نے علم و آگہی کے قافلے کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا، جس کے بعد سے آج تک انسانیت کا قافلہ بدبختی کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔

وحی کی ضرورت

یہ امرِ واقعہ ہے کہ غیبی حقائق کے جاننے کا ذریعہ عقلِ انسانی نہیں ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام، جنھوں نے خدا، آخرت اور غیب کے متعلق عقائد کی تعلیم انسانوں کو دی ہے، وہ ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ غیر معمولی علم انھیں تعقل، تفکر یا اشراق Illumination کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے۔ درحقیقت اس میدان میں عقل عاجز ہے۔ انسانی زندگی کے لیے غرض و غایت مقرر کرنا، خیر و شر کے لیے ابدی معیار متعین کرنا، انسانی معاشرہ کے لیے ضابطۂ حیات تجویز کرنا، یہ تمام امور طے کرنا کسی انفرادی یا اجتماعی عقل کے بس کی بات نہیں ہے، جس کی درماندگی اور نارسائی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ؂

ہزار انداز پیچاک خرد ہے
کوئی حل ہو محلِ صد گماں ہے

لیکن یہ کام ایسی ہستی کا ہے جو علیم و خبیر ہو، جو انسان کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو، جس پر انسان کا ماضی اور مستقبل پوری طرح عیاں ہو، جو اس کائنات کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو۔ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ وہ ہستی عالمِ انسانیت سے بلند اور برتر ہو، تاکہ اس کا بنایا ہوا قانون بے لاگ عدل کا ضامن ہو، دائمی اقدارِ حیات کا حامل ہو، مثبت غایات کا داعی ہو اور تمام انسانوں کے نزدیک لائقِ صد احترام ہو۔ ظاہر ہے کسی ایک انسان کا یا انسانوں کے مجموعے کا وضع کردہ قانون اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ انسان ــــ فردِ واحد ہو، مجلسِ قانون ساز ہو، ــــ قانون سازی کے مذکورہ بالا تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ اساسی طور پر انسان قانون سازی کے منصبِ رفیع کے لیے نااہل ہے۔ علیم و خبیر ہمہ مقتدر ہستی اللہ تعالیٰ ہی صرف یہ تمام تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ اس لیے عالمِ انسانیت کی صلاح و فلاح اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کی پیروی سے وابستہ ہے۔ قانونِ الٰہی کی مخالفت میں انسانیت کا خسران و خسارہ ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (سورۃ نساء)

"اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق (اپنے معاملات کے) فیصلے نہیں کرتے ہیں بس وہی ظالم لوگ ہیں۔"

یہ بالکل غلط ہے کہ انسان ابتدا میں اندھیرے میں بھٹکتا پھرتا تھا اور بتدریج اس نے راہِ ہدایت ڈھونڈی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گمراہی میں بھٹکنے کے لیے نہیں پیدا کیا۔ اول روز سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے نیک نفس انسانوں ہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول اور نبی بنا کر بھیجا۔ ان رسولوں نے ہر دَور میں انسانوں کو راہِ راست کی تعلیم دی جو امور عقل کی دسترس سے باہر تھے۔ ان کی تعلیم دی، راہِ ہدایت دکھائی، زندگی کی غرض و غایت سمجھائی۔ نیکی اور بدی، خیر و شر کا پیمانہ انسانوں کے ہاتھوں میں دیا۔ اخلاق میں شستگی و شائستگی، اعمال میں عدل و استحکام، زندگی میں امن و طمانیت انھی مقدس نفوس کا عطیہ ہے۔ جب انسان پر عالمِ طفولیت طاری تھا تو ان بزرگوں نے انسانوں کو ان امور کی بھی تعلیم دی جو عام طور پر عقل کا دائرہ کار ہے، اور جن کے جاننے کا انسان بذاتِ خود مکلف ہے۔ انھوں نے پاکیزہ حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق والی زندگی گزارنے کے تمام طریقے انسان کو سکھائے۔ ہمدردی اور فلاحِ عوام کے وہ تصورات جو مادہ پرست مغرب، بلکہ مذہب دشمن رُوس میں بھی مقبول ہیں، ان کا منبع اور سرچشمہ ان ہی قدسی صفات ہستیوں کی تعلیمات ہیں:

آج جس جا بھی روشنی پیدا ہے
مستنیر جبینِ جبرائیل

وحیِ الٰہی کی قدامت

ان نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات کی وجہ سے انسانوں کو اپنی طفولیت کے زمانہ ہی میں وہ اخلاقی رفعت اور وہ روحانی بالیدگی حاصل ہو چکی تھی جو انسانی معاشرہ کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ آج تک اس میں کوئی اساسی یا جوہری اضافہ نہ

ہو سکا۔ مصر قدیم کے پانچویں خاندان کے ایک بادشاہ بطاح حوطب Patah Hotep کے عہد حکومت کی دو تحریریں دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہیں۔ مصری آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے ان کو حاصل کر کے شائع کر دیا ہے۔ ان کا زمانہ پانچ ہزار سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ یہ "نصیحت الملوک" نامی کتاب کے دو ورق ہیں۔ اس کو دُنیا کی قدیم ترین کتابِ اخلاق کے اوراق کہنا چاہیے۔ اس کے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

(۱) خاندان کے سربراہ کو نصیحت کی جاتی ہے:

"اگر تُو عقل مند ہے تو اپنے گھر کی دیکھ بھال کرے گا۔ تُو اپنی بیوی کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آئے گا۔ اس کو کپڑے پہنائے گا۔ اس کو کھانا کھلائے گا۔ اگر وہ بیمار پڑ جائے تو اس کی تیمارداری کرے گا۔ اس کو ساری زندگی خوش رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے ساتھ سختی مت کر۔ اپنے نوکروں کے ساتھ حتی الامکان مہربانی کے ساتھ پیش آ۔ وہ گھر سکھ چین اور خوشی سے محروم رہتا ہے، جہاں نوکر خوش و خرم نہ ہوں۔"

(۲) بادشاہ کو نصیحت کی جاتی ہے:

"اگر تُو ذمہ داری کا طلب گار ہے تو اپنے اندر کمال پیدا کر۔ اگر تُو مشورہ میں شرکت کرے تو یاد رکھ خاموشی، فضول گوئی سے بہتر ہے۔"

یہ بہت اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس سے بہت دُور رس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ تقابل کے لیے ذرا غور کیجیے۔ آج سے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال قبل کی تو ایسی بلند اخلاقی تعلیم ملتی ہے لیکن اس کے تین ہزار سال بعد یونان کے فلسفی غیر یونانیوں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ وہ عورتوں، غلاموں اور غیر یونانیوں کو انسان سے فروتر درجہ دیتے تھے۔ ان کی فلک پیما عقل کی جولانیاں خود غرضی اور اغراض پرستی کے دائرہ سے باہر قدم نہ رکھ سکیں۔ ان کے برخلاف مصر میں ہزاروں سال قبل اتنی ارفع اور اتنی اعلیٰ تعلیم موجود تھی۔

یہ فکری پرواز معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو وحی کا فیضان معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو بنی اسرائیل کے نبیوں جیسی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زمان و مکان کے ہزار ہا اختلافات کے باوجود تعلیم کی یک رنگی، ایک ہی سرچشمۂ علم و عرفان کی طرف غمازی کر رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ رسولوں کی تعلیم ہے۔ یہ رسول ہر ملک اور ہر قوم میں بھیجے گئے ان کی تعلیمات کے بقیہ آثار مختلف قوموں کے پاس قومی روایات کی شکل میں محفوظ ہیں۔

احمدا! تا گم نہ گردی ہوشیار
ایں جرس از کاروان دیگر است

یہاں سے ایک اور اہم معاملہ کی جانب رہنمائی ملتی ہے۔ انسان کے پاس حواس اور عقل کے علاوہ ایک اور ذریعہ علم بھی تھا، جس کے ذریعہ عہدِ طفولیت میں بھی انسان کو بہترین اخلاقی تعلیمات اور روحانی بالیدگی ملتی رہی ہے۔ وہ ذریعہ وحیٔ الٰہی کا ذریعہ تھا۔ اس ذریعہ سے اکتسابِ علم کر کے انبیاء کرام انسانوں کو راہِ ہدایت کی تعلیم دیتے تھے اور نفوس کا تزکیہ کرتے تھے۔

انسان کی تخلیق کے ساتھ اس کی ہدایت اور رہنمائی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود قبول کر لی تھی۔ کسی دور میں بھی انسان کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑا گیا۔ عقل و ادراک کی قوتیں تو بہت مدت کے بعد بلوغت کو پہنچی ہیں۔ کائنات کے رازوں کی سراغ رسانی کا جذبہ تو بہت مدت بعد انسان کے دل میں بیدار ہوا ہے تمدن نے بہت سست رفتاری سے ترقی کی ہے۔ لیکن جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے، خالقِ انسان نے اوّل روز سے ہی محض اپنے فضل و کرم سے اس کا انتظام فرما دیا تھا تاکہ جہالت اور لاعلمی کا عذر پیش کر کے کسی دور کا انسان بھی اپنی بدراہی اور بداعمالی کو جائز نہ قرار دے سکے۔ پہلا انسان جو دنیا میں آیا وہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

انبیاء کرام کی تعلیمات نے فلاح و صلاح کا راستہ دکھایا۔ نجات و خسران

کا فرق سمجھایا۔ یہ اعلیٰ تعلیمات آج بھی قوموں کا ورثہ ہے۔ آج بھی اس تعلیم کے مختلف اجزاء دور دراز ملکوں میں مختلف قوموں کے پاس موجود ہیں۔ انسان کی حقیقی صلاح و فلاح کی کوئی اسکیم جب کبھی پیش کی جاتی ہے، وہ اسی قدیم ورثہ سے ماخوذ ہوتی ہے۔ امریکی مصنف ایمرے ریوز Emery Reves نے اپنی کتاب "تشریح امن" Anatomy of Peace میں اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے:

"اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکامِ عشرہ دنیا میں موجود نہ ہوتے تو انگلستان کا دستوری قانون Magna Charta-1215 وجود میں نہ آتا۔ اگر میگنا کارٹا نہ ہوتا تو قانونِ حقوق Bill of Rights 1689 انگلستان کا دوسرا دستوری قانون بھی نہ بن پاتا، اور پھر اقوامِ متحدہ کا چارٹر ۱۹۴۵ء بھی نہ بن سکتا تھا۔"

درحقیقت انسان کی صلاح و فلاح دنیوی اور اخروی ہدایتِ الٰہی اور تعلیماتِ وحی کی پیروی کرنے میں مضمر ہے۔ ان کی مخالفت، ان سے اعراض اور ان سے بے نیازی میں انسان کا خسارہ ہی خسارہ ہے۔

انسان کی حقیقت

فکرِ انسانی کی تیسری اکائی انسان ہے۔ انسان اگرچہ مادی جسم رکھتا ہے، اس لحاظ سے عقلی کاوش کی دسترس میں ہے، لیکن حقیقی انسان ہرگز مادی نہیں ہے۔ انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کا مقام متعین کرنے میں عقل نے خوب ٹھوکریں کھائی ہیں۔ جس کی سزا ہر دور میں انسانی معاشروں نے بھگتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان کی حقیقت اور حیثیت کے متعلق غلط نظریات قائم کرنے کے بعد انسانی زندگی کا نظام مختل ہو جاتا ہے۔ معاشرہ انحطاط کی راہ پر پڑ جاتا ہے۔ اضطراب، انتشار اور ہلاکت سے دوچار ہو جاتا ہے۔

مغربی معاشرہ کے معمار حکماء اور فلاسفہ نے بھی انسان کی حقیقت کے

متعلق غلط نظریات قائم کر کے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انسانی معاشروں کو بھی گمراہی کے غاروں میں دھکیل دیا، جس کے نتائج بد سے آج مغربی معاشرہ بُری طرح پریشان ہے۔ جس سے آج ہر چشمِ بینا واقف ہے۔ ذرا ان مغربی مفکّرین کی پروازِ خیال ملاحظہ ہو:۔

ارسطو : انسان دو ٹانگوں والا جانور ہے۔

ڈیکارٹ : انسان ایک ایسی مشین ہے جس میں رُوح موجود ہے۔

روسو : انسان ایک وحشی ہے، البتہ اس کو سدھایا جا سکتا ہے۔

ہابز : انسان ایک دُوسرے کے لیے بھیڑیا ہے۔

ہیوم : انسان کو بدمعاش ہی تصوّر کرنا چاہیے۔

ڈارون : انسان ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے۔

فرائڈ : انسان ایک ایسا حیوان ہے جس کی جنسی جبلّت منحرف ہو کر تباہی مچا دیتی ہے۔

سارتر : انسان ایسا جانور ہے جس کو عقل و خرد سے بیگانہ بنا کر دُنیا میں پھینک دیا گیا ہے۔

جب مغربی مفکّرین کے نزدیک انسان شرارت کا پُتلا ٹھیرا، تو انسانی معاشرہ بھی لامحالہ شرارت سے پُر ہوگا۔ شرافت اور انسانیت وہاں کیسے پروان چڑھ سکتی ہے۔ مسئلۂ ارتقاء کے زیرِ اثر انسان کو بڑا حیوان قرار دے کر اہلِ مغرب نے انسانیت پر بہت بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ مغربی نظامِ حیات کو اس تصوّر نے بُری طرح مجروح کیا ہے۔ یہ فسادِ فکر و نظر مغربی معاشرہ کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کے زہر سے مغربی تہذیب کی رُوح اندر ہی اندر گُھلتی چلی جا رہی ہے۔ ظاہری خیرہ کن چمک کے باوجود یہ تہذیب رُو بہ زوال ہے۔

انسان کو اعلیٰ درجہ کا حیوان تسلیم کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان اشرف المخلوقات کے مقامِ رفیع سے گر کر حیوانیت اور بہیمیت کی پست سطح پر آ گیا۔ انسانی افعال

و اعمال کو حیوانی معیار پر پرکھا اور جانچا جانے لگا۔ مثال کے طور پر مغرب میں علمِ نفسیات کے ماہرین نے جبلت Instinct کی تعریف کرتے ہوئے یہ اصول وضع کیا کہ انسانی جبلّت صرف اس کو سمجھا جائے گا جس کی اصل حیوانوں میں موجود ہو۔ اس کے تحت کھانا پینا، لڑنا جھگڑنا، شہوت رانی کرنا، بخل دکھلانا، یہ سب جبلّی افعال قرار پائے، اس لیے کہ ان کی اصل حیوانوں میں موجود ہے۔ مگر جذبۂ عبودیت کو ایک عارضی جذبہ قرار دے دیا گیا، اس لیے کہ یہ صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور حیوانوں میں مفقود ہے۔ حالانکہ یہ ایسا جذبہ ہے جو انسانی نوع کے تمام افراد میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ نصف صدی تک شب و روز الحاد و دہریت کی تعلیم و تلقین بھی رُوسی انسان کو اس فطری جذبہ سے بیگانہ نہ بنا سکی۔ آج بھی لینن کے مقبرے پر مرد اور عورت زائرین کا ہجوم بدھ کے روز اسی نیاز مندی کی یاد تازہ کر دیتا ہے، جس عقیدت کے ساتھ سابق میں مسیحی ولیوں Saints کے آستانوں پر مجمع لگتا تھا۔ صرف اظہارِ عقیدت کا مظہر بدل گیا ہے۔ جبلّت کا انحراف Perversion جبلّت کی واقعیت کی سب سے بڑی شہادت مہیا کرتا ہے۔ اتنی قوی جبلّت کا انکار انسان کو صرف حیوان تسلیم کرنے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

دُوسرا نتیجہ اس ذہنیت کا یہ نکلا کہ انسان کے افعال اور اعمال کے متعلق اب نقطۂ نظر بدل گیا۔ پہلے معیاری Normative یا مثالی Idealist تھا، اب بلندی اور رفعت کا تصوّر اذہان سے محو ہو گیا ہے۔ آج معیار عملی Realist اور واقعی Positivist بن گیا ہے۔ انسان اب اخلاقی بلندی اور رُوحانی رفعتوں کی جانب نگاہ اٹھانے کے بجائے، حیوانوں کی عادت اور خصلتوں کی پستی میں گرنے لگا ہے۔ جو عادت یا خصلت حیوانوں میں پائی جاتی ہے، وہ واقعیت ہے، وہ حقیقت ہے۔ اس کے کرنے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اس نظریہ کے تحت زنا کاری اور

اغلام بازی جیسے افعال کو امرِ واقعی قرار دے کر معاشرہ میں آزادی سے ارتکاب کرنے کی سندِ جواز دے دی گئی۔ حتیٰ کہ کلیسائے انگلستان کے سب سے بڑے نمائندے آرچ بشپ آف کنٹربری نے بھی اس جواز پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ معلوم نہیں اسی نظریہ کے تحت چوری، قتل اور اغوا کیوں جرم قرار پاتے ہیں؟ ان کو امرِ واقعہ کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا ہے؟

حیوانیت کی سطح پر گر جانے کے بعد کوئی امر انسان کو نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام بن جانے سے نہیں روک سکتا۔ اخلاق و آداب، ضبط و تحمّل، شرم و حیا کی تمام پابندیوں کو وہ توڑ کر پھینک دیتا ہے اور اسی کو وہ آزادی سمجھتا ہے۔ ایسی آزادی جنگل میں گھومنے والے ہر بھیڑیئے کو حاصل ہے کہ جس کو چاہے پھاڑے۔ ایسی آزادی گلیوں میں گھومنے والے ہر کتّے کو حاصل ہے کہ جس پر چاہے بھونکے۔ حیوانوں سے رِشتہ قائم ہو جانے کے بعد اب انسان کو ایسی ہی آزادی چاہیے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے یہ آزاد انسان ہر فردِ بشر کو شکار بنانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یورپ کا یہی آزاد انسان ہے جس نے اپنی جوع الارض کا ہدف کمزور اقوام کو بنانے میں ادنیٰ تامل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی خشمگیں نگاہوں کے سامنے نہ کسی فرد کی عزت محفوظ ہے، نہ کسی قوم کی آزادی محفوظ ہے۔ اپنی ستم رانیوں کے باعث درحقیقت آج یہ ننگِ انسانیت بن گیا ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات یہاں یہ اعتراض کریں کہ آپ کا تبصرہ یک طرفہ اور مبالغہ آمیز ہے۔ اہلِ مغرب میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ ہمیں بھی تسلیم ہے کہ اہلِ مغرب میں بعض خوبیاں ہیں اور اچھی صفات ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ خوبیاں مسیحی اخلاق کے آثارِ باقیہ ہیں یا شجرِ لادینیت اور مادیت کے ثمرات ہیں۔ آدمی اگر یک چشم نہ ہو تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جس قدر لادینیت کا درخت گھنا اور چھتنار بنتا جا رہا ہے، اسی نسبت سے یہ خوبیاں

اور صفاتِ حسنہ کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہیں۔ بے حیائی اور بداخلاقی کی طغیانی فزوں سے فزوں تر ہوتی جا رہی ہے۔ اِس لیے ان خوبیوں اور صفاتِ حسنہ کو لادینیت کے کھاتے میں ڈالنا کسی طرح درست نہیں۔

شرفِ انسانیت

صحیح حقیقت یہ ہے

کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ وہ حیوانیت اور ملکوتیت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ قدرت کا شاہکار ہے۔ وہ ایک حسین مرقع ہے۔ مائل بہ روحانیت ہو تو فرشتوں کو شرمسار کر دے اور اگر پستی میں گرے تو وہ درندوں سے سبقت لے جاتے۔

اہلِ مغرب اس امر کی جانب سے بالکل غافل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس حیوان کے ساتھ خاص معاملہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (بلد) — "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔"

دُوسرے مقام پر فرمایا ہے:

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي۔ — "اور ہم نے انسان کے اندر اپنی رُوح پھونک دی۔"

اِس انعامِ الٰہی کے بعد انسان کے اندر رُوحانی ارتقاء کے غیر معمولی امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ حیرت انگیز معاملہ دراصل شرفِ انسانیت کا اعلان ہے۔ جو لوگ صرف حیوان ہونے کی رٹ لگاتے ہوتے ہیں ان کے لیے درسِ عبرت ہے۔ اس شرف کا ہی فیضان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل جیسی نعمت سے نوازا، جو کائنات میں صنعتِ خداوندی اور قدرتِ خداوندی کا مشاہدہ کرتی ہے، مطالعہ کرتی ہے، غور و خوض کرتی ہے، فہم

حاصل کرتی ہے، پھر ان کے پس پردہ جاری قانونِ فطرت اور سنّت اللہ کو دریافت کر لیتی ہے۔ یہ تفکّر، تدبّر، تلاش، جستجو اور حقیقت رسی کی لگن خاص عطیہ الٰہی ہے۔ علوم و فنون، تہذیب و تمدّن، سائنس اور ٹیکنالوجی کی تمام تر ترقی اسی عطیہ الٰہی کی رہینِ منت ہے۔ یہ بات آج ہر شخص پر عیاں ہے۔

اس سے بڑھ کر مزید عطیہ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذہنِ انسانی میں ایک عجیب و غریب صفت یہ ودیعت کی ہے کہ بلا مشاہدۂ فطرت اور بلا مطالعہ قدرت محض اپنے ذہن سے اس نے چند ایسے قواعد اور ضوابط کا استخراج کیا ہے جو فطرت کے ہر مظہر پر منطبق ہوتے ہیں۔ دُنیا کے تمام علوم و فنون اور سائنس خارجی مظاہرات سے مطالعہ کے بعد استنباط کیے گئے ہیں۔ لیکن ریاضی اور منطق ایسے علوم ہیں جو انسان نے محض اپنے ذہنِ رسا کی مدد سے وضع کیے ہیں۔ یہ علوم خارجی مظاہرات سے ہرگز استنباط کردہ نہیں ہیں۔ لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ ریاضی اور منطق کے اصول و ضوابط دُنیا کے تمام مظاہرات پر صادق آتے ہیں۔ کوئی علم ان اصولوں پر پُورا اُترے بغیر علم نہیں بن سکتا۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ انسانی ذہن کے وضع کردہ یہ اصول چاند اور مریخ کی دنیا پر بھی صادق آ رہے ہیں۔ یہ حیرت انگیز معاملہ ہے۔ گویا خلاّقِ عالم کے ذہن سے انسانی ذہن نے اکتساب نُور کیا ہے۔ جب ہی تو اس کے وضع کردہ علم کی صداقت چاند اور مرّیخ پر بھی قائم ہے۔ کیا یہ انسان کے کمال و شرف کا مظہر نہیں ہے؟ کیا انسان نِرا حیوان ہے؟ فی الواقع یہ سارے کمالات نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ کی اَدنیٰ سی تفسیر ہیں۔

یورپ کا تصورِ انسان

یورپ کے مفکّرین نے اس کے برعکس ایک دُوسری راہ اختیار کی۔ خُدا کا انکار کر دینے کے بعد انھوں نے انسان کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دیا۔ اناسیت یعنی

انسان پرستی Humanism اور آزادروی Liberalism کے زیرِ اثر جب خُدا پرستی کا انکار کر دیا، حتیٰ کہ نطشے نے اعلان کر دیا کہ خدا کا اِنتقال ہو گیا ہے، تو انسان پرستی کو فروغ حاصل ہو گیا۔ گزشتہ چار سو سال سے یورپ کے تمام مفکّرین انسان پرستی کے معبد کی تعمیر میں لگے ہوتے ہیں۔ مارٹن لُوتھر سے لے کر، جس نے اعلان کیا تھا کہ "جو بات عقل کے خلاف ہے وہ خُدا کے بھی خلاف ہے" ژاں پال سارتر تک، جس نے اعلان کیا ہے کہ "انسان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا، مذہب اور اخلاق سے چھٹکارا حاصل نہ کر لے۔" یہ تمام مفکّرینِ انسان کی الوہیت Divinity اور تقدیس Holiness کے نغمے گا رہے ہیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ اُن کا تصورِ انسان محض حیاتیاتی ہے، جس کو مذہب، اخلاق اور خُدا سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کی تمام تر توجہ قوّت و مقدار، جسمانیت اور توانائی کی طرف ہے۔ اخلاق، اقدار اور رُوحانیت جیسے تصوّرات کو وہ بے معنی سمجھتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر مادّہ اور مادّی دُنیا ہے۔ رُوح اور رُوحانی دُنیا سے وہ بیگانۂ محض ہو گئے ہیں۔

اس وجہ سے اہلِ مغرب کی نگاہوں کو صرف وہ انسان نظر آتا ہے جو یونان میں اولمپک Olympic کے کھیلوں میں مشغول رہتا تھا، جو روم کے اکھاڑوں میں درندوں سے مقابلہ کر کے اپنی تنومندی کا مظاہرہ کرتا تھا، جو معمل میں بیٹھ کر سائنسی تجربات کرتا ہے، جو ایوان ہائے نمائندگان میں دُھواں دھار تقریر کرتا ہے، جو سیاست کی بساط پر مہرے لڑاتا ہے۔ ان تمام مشاہدات کے بعد وہ انسان کو زیادہ سے زیادہ ایک حیوانِ ناطق (بولتا جانور) ماننے کو تیار ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اہلِ مغرب کو انسانیت کے معلّم زردشت، کرشن، بدھا اور کنفوشش جیسے انسان نظر نہیں آتے۔ ان کو حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ صلوات اللہ علیہم اجمعین جیسے نفوسِ قدسیہ بھی نظر نہیں آتے، جنھوں نے لاکھوں کروڑوں

انسانوں کی زندگیاں سدھار دیں جنھوں نے انسانوں کو پستی سے نکال کر اخلاق اور رُوحانیت کی اَوجِ ترقی پر پہنچا دیا، جن کی حکومت ہزاروں سال سے دِلوں پر قائم ہے، جن کے ناموں سے آج بھی کروڑوں سینوں میں جوش اور سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے، جو فِی الحقیقت انسانیت کے صحیح معمار تھے، جنھوں نے انسان کو شرافت اور فضیلت کا سبق سکھایا۔ اُن کی تعلیمات سے معاشرہ میں امن و راحت، سکونِ طمانیت، عدل و انصاف، اخوّت و مساوات کے اصُول جاری و ساری ہُوئے۔

عقل پرستی

لادینیت اور الحاد کا یہ طولانی سفر مغرب کے حکما۔ اور فلاسفہ نے عقل کی رہنمائی میں طے کیا ہے۔ نشأۃِ ثانیہ Renaissance کے مفکّرین اور دانشوروں نے عقل پرستی کا صُور اِس زور شور سے پھُونکا کہ اس کے آگے تمام دُوسری آوازیں دب گئیں۔ دُوسرے تمام ذرائع معلومات کو سائنس دانوں نے ساقط الاعتبار قرار دے دیا۔ ساری مغربی دُنیا نے یہ بات تسلیم کر لی کہ علم صحیح کا سرچشمہ صرف عقل ہے۔ مغرب میں بلا شرکتِ غیرے عقل کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ عقل کی افادیت اور اہمیت سے کسی صاحب فہم شخص کو انکار نہیں ہے لیکن مطلق حکمرانی کا یہ منصب کیا عقل کو زیب دیتا ہے؟ کیا عقل اس منصبِ رفیع کی اہل ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ تعقُّل و ادراک ذہنِ انسانی کا طبعی وظیفہ ہے۔ حیاتِ دُنیا کی جد و جہد میں فرائضِ خلافت ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عقل و ادراک کی قوتیں انسان کو ودیعت فرمائی ہیں۔ عقل انسان کی بہترین رفیقِ کار اور معاون ہے۔ انسان کی عظمت و رفعت، تہذیب و تمدّن، علوم و فنون، ایجادات و انکشافات سب تعقّل و تجسّس کی قوّتوں کی رہینِ منت ہیں۔ کسی صاحبِ ہوش انسان کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر عقل کا دائرۂ کار عالمِ مادیات ہے، بلکہ یہاں بھی حقائق الاشیاء کی سراغ رسانی میں عقل ناکام اور عاجز ہے۔ اور حریمِ حقیقت

کبریٰ تک تو اس کی پرواز ہی نہیں۔ حقائق ماوراءِ مادیات و طبعیات اور عالمِ مغیبات کا علم انسان کو وحیِ الٰہی کے ذریعہ انبیاء کرام کے توسط سے حاصل ہوتا ہے، کسی دُوسرے علم کی وہاں تک رسائی نہیں ہے۔ اس لیے عقل کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ وہ برتر ذریعہ علم یعنی وحیِ الٰہی کے زیرِ نگرانی اپنا وظیفہ انجام دے۔ عقل اگر آزادانہ اور تنہا سفر پر روانہ ہوگی تو ٹھوکر کھانا اس کا مقدر بن چکا ہے۔ علامہ اقبال نے عقل کی حقیقت سے یُوں نقاب کشائی فرمائی ہے ؎

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے؟ چراغِ راہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغِ راہ گزر کو کیا خبر ہے

اِس لیے عقل کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ وحی کی امامت و رہنمائی میں سفر کرے ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

عقل کی محدودیت اور نارسائی

عقل کی کوتاہ دامنی اور نارسائی کی جانب سب سے پہلے مسلمان علما۔ اور حکما۔ نے دُنیا کی توجہ مبذول کرائی۔ امام غزالیؒ (۱۰۵۸ء تا ۱۱۱۱ء) نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "المنقذ من الضلال" میں عقلی استدلال کی کوتاہ دامنی کی جانب واضح اشارات کیے ہیں۔ شیخ شہاب الدین مقتول (۱۱۹۱ء تا ۱۱۵۳ء) نے فلسفہ کے ابطال میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ہے "کشف الفضائح الیونانیہ"۔ اس میں عقلِ خالص کی بے چارگی کو ثابت کیا ہے۔ اسلامی دُنیا کے بہت بڑے فلسفی امام فخر الدین رازیؒ (۱۱۴۹

۱؎ "فلسفۂ عجم" از علامہ اقبال۔ اُردو ترجمہ، صفحہ ۱۴۳۔ حاشیہ

تا ۱۲۰۹ء) نے عقل کی نارسائی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

هرگز دلِ من ز علم محروم نہ شد   کم ماند اسرار کہ مفہوم نہ شد
هفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز   معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

امام ابنِ تیمیہؒ (۱۲۶۳ء تا ۱۳۲۸ء) نے اپنی مشہور کتاب "الرد علی المنطقیین" میں عقل کی کوتاہی کا صاف ذکر کیا ہے۔ مشہور مؤرخ اور مفکر علامہ ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) نے "مقدمہ" میں صراحت سے لکھا ہے کہ "مسئلۂ توحید، آخرت اور علمِ نبوت کو عقل کی میزان میں تولنا ایسا ہے جیسے سُنار کے کانٹے سے پہاڑ کی جسامت و ضخامت کا وزن کرنا"۔ یعنی امور ما بعد الطبعیات کے متعلق رائے قائم کرنا عقل کی بساط سے باہر ہے۔

جدید دور میں مشہور فلسفی عمانوئیل کانٹ (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۶ء) نے عقل کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا۔ اُس نے "تنقیدِ عقلِ محض" The Critique of Pure Reason میں نہایت تفصیل کے ساتھ عقل کی محدودیت اور نارسائی کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے محسوسات کو تو سب جانتے ہیں کہ وہ مادی الاصل ہیں۔ عقل و تفکر محسوسات سے ہی غذا حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے تجریدی افکار کی بنیاد بھی محسوسات پر ہے۔ عالمِ محسوسات کا دائرہ کار زمان و مکان میں محدود ہے عالمِ افکار میں خواہ کتنی ہی جولانیاں دکھائی جائیں۔ بہرکیف عقل کی پرواز لامحدود نہیں ہے۔ حریمِ حقیقت تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

علمِ تحلیلِ نفسی Psycho Analysis کے جدید دَور میں ماہرترین مُفکر جنگ Jung 1875–1961 کے اعترافات بھی امام رازی کے مشابہ ہیں۔ اسّی سال کی پختہ عمر میں وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتا ہے:

"میرے لیے اس بات کا تعین کرنا ناممکن ہے کہ کیا کیا اشیاء آخرکار قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ اور کیا نہیں ہیں۔ میں اپنے

emories, Dreams and Reflection — By C.E. Jung — 1961.
Reflections

متعلق اور اپنی زندگی کے متعلق کوئی حکم نہیں لگاتا۔ مجھے کسی شے کا یقین حاصل نہیں ہے۔ کسی معاملہ میں فی الحقیقت میرے پختہ اور واضح معتقدات نہیں ہیں۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں پیدا ہوا تھا اور زندہ ہوں۔ اور مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ میں خود نہیں آیا بلکہ لایا گیا ہوں اور یہ کہ میرے وجود کا انحصار کسی دوسری شے پر ہے جسے میں نہیں جانتا۔"[۱]

عقل نے بجلی کی قوت کو مسخر کر لیا۔ اس "جن" سے وہ ہزارہا قسم کی خدمات لیتی ہے۔ لیکن اس کی حقیقت کے ادراک سے ابھی تک قاصر ہے۔ وہ مظاہرات Phenomena اور صفات Attribute سے تو واقف ہو جاتی ہے لیکن ذات Noumena سے واقفیت حاصل کرنے سے معذور ہے۔ وہ اشیاء کے فوری Immediate اور قریبی Proximate مقاصد بیان کر دیتی ہے۔ لیکن اصلی اور حقیقی مقاصد Intrinsic and Ultimate بتانے میں بالکل عاجز ہے۔ وہ اشیاء کی قدر و قیمت انسان کے فوائد اور منافع کے اعتبار سے متعین کر سکتی ہے یعنی اقدار لغیرہٖ Instrumental Values کا تو اسے علم ہو جاتا ہے لیکن اقدار بذاتہٖ Intrinsic Values کا اس کو علم نہیں ہوتا۔ وہ یہ تو بتا سکتی ہے کہ بارش کس طرح ہوتی ہے؟ زلزلہ کس طرح آتا ہے؟ لیکن وہ یہ بتانے سے عاجز ہے کہ بارش کیوں ہوتی ہے اور کیوں نہیں ہوتی؟ زلزلہ کیوں آتا ہے اور کیوں نہیں آتا؟ لی کومٹ نے درست لکھا ہے:

"اس بات کا اظہار شاید تعجب خیز نظر آئے کہ سائنس کسی مسئلہ کا قطعی

اور قابلِ اطمینان حل پیش نہیں کرتا۔[*]

حقائقِ بسیطہ سے نیچے اُتر کر عالمِ انسانیت میں بھی عقل کی تہی مائیگی اور نارسائی ظاہر ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس بارے میں یوں لکھا ہے:

"انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالمِ اصغر ہے۔ جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، جذبات و رجحانات ہیں، نفس اور جسم کے مختلف مطالبے ہیں، رُوح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں۔ پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے۔ وہ بے حد و حساب پیچیدہ تعلقات سے مرکب ہوتی ہے اور تہذیب و تمدن کے نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پھر دُنیا میں جو سامانِ زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، اس سے کام لینے اور اس کو تمدن میں اِستعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ انسان اپنی خلقی کمزوری کی وجہ سے اس پُورے عرصۂ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خُود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو، اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے، اس کے سارے جذبات و رُجحانات میں توازن قائم رہے، اس کے سب اندرونی اور بیرونی تقاضے تناسب کے ساتھ پورے ہوں، اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے اور مادی اشیاء کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل، انصاف اور

[*] Human Destiny, by Le Comte, page 36

حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہے۔ جب انسان خُود اپنا رہنما اور اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو، ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلاارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی اس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حدود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضرورت، اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی، بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو۔ مگر انصاف پھر بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھر وہی عمل رونما ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا، انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقتضیات کے مطابق ایک خاص رُخ پر لے جاتا ہے۔ جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ ہچکولے کھاتی رہتی ہے اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی چلی جاتی ہے۔ تمام وہ راستے جو خود انسان نے اپنی زندگی کے لیے بنائے ہیں خطِ منحنی کی شکل میں واقع ہیں۔ غلط سمت سے چلتے ہیں اور غلط سمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔"

موجودہ زمانے کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی

پے در پے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چلی جارہی ہے۔ یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ جدلی عمل Dialectical Process انسانی زندگی کے ارتقا کا فطری طریق ہے۔ وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقاء کا راستہ یہی ہے کہ ایک انتہا پسندانہ دعویٰ Thesis اسے ایک رُخ پر بہالے جائے پھر اس کے جواب میں ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ Anti Thesis اسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے۔ اور پھر دونوں کے امتزاج Synthesis سے ارتقاء حیات کا راستہ ہے۔

حالانکہ دراصل یہ ارتقاء کی راہ نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء میں بار بار مانع ہورہے ہیں۔ اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انہوں نے سواء السبیل (اعتدال کی شاہراہ) کو دیکھ لیا ہوتا تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ انسان کے لیے ارتقاء کا صحیح راستہ یہی سواء السبیل ہے نہ کہ خط منحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔[1]

انسانی زندگی میں رُونما ہونے والے واقعات وحوادث کے اسباب و نتائج کا صحیح ادراک کرنے سے بھی عقل عاجز و درماندہ ہے۔ انسانی زندگی کے واقعات وحوادث اسباب در اسباب اور نتائج در نتائج کا ایک طویل سلسلہ پیدا کر دیتے ہیں، جو بعض اوقات صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ ان واقعات یا حوادث کے متعلق رائے قائم کرنے، صحیح یا غلط، خیر یا شر ہونے کا حکم لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس سارے طویل طویل سلسلہ اسباب و نتائج کو بیک وقت نگاہ میں رکھا جائے۔ مگر اس سلسلہ کار میں اس قدر غیر معمولی وسعت

---

[1] تفہیم القرآن، حصہ اوّل از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ صفحہ ۲۵۲

اور پہنائی ہے کہ عقل انسانی اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ اتنی بڑی تصویر ہے کہ عقل کا چوکھٹا اس کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ پھر معاملہ گزشتہ واقعات کا ہی نہیں ہے، ان واقعات کے اثرات بعض مرتبہ مستقبل پر بھی پڑتے ہیں۔ عقل انسانی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے۔ جو مستقبل بینی کر سکے یا پیش بینی کر سکے۔

جوہری بم بنانے والے سائنس داں کے خلاف ہلاکتِ انسانی کی فردِ جرم اس وقت تک صحیح طور پر تیار نہیں ہوسکتی جب تک یہ نہ معلوم ہوجائے کہ اس ہلاکت خیز ایجاد سے کتنے افراد متاثر ہوئے اور یہ نہ معلوم ہوجائے کہ آئندہ ان کی نسلیں کس قدر اس سے متاثر ہوں گی۔ نیز یہ بات نہ معلوم ہوجائے کہ آئندہ کتنے سینکڑوں یا ہزاروں شہروں اور بستیوں کا حشر ہیروشیما اور ناگاساکی جیسا ہونا مقدر ہوچکا ہے۔ اس لیے کہ آئندہ کی تباہیوں اور غارت گریوں میں موجدِ اوّل برابر کا شریک رہے گا۔ جب تک یہ تمام معلومات حاصل نہ ہوجائیں، اس وقت تک یہ فردِ جرم مکمل نہیں ہوسکتی۔ کیا آج کوئی انسانی عقل یہ تمام تخمینہ لگا سکتی ہے؟ کیا مستقبل بینی کا کوئی یقینی ذریعہ عقل کو حاصل ہوگیا ہے؟ ظاہر ہے عقل یہ عظیم و وسیع کام کرنے سے عاجز و درماندہ ہے۔

اسی طرح رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلامی انقلاب کے دُوررس اور ہمہ گیر نتائج و اثرات نوعِ انسانی پر پڑ چکے ہیں اور رہتی دُنیا تک نوعِ انسانی اس منبعِ نور سے اکتساب کرتی رہے گی۔ کیا کوئی ذہنِ رسا ان تمام مختلف النوع اور مختلف الجہات اثرات کا احاطہ کرسکتا ہے؟ عالمِ اسلام سے صرفِ نظر کرلیا جائے تب بھی یورپ اور ہندوستان میں طبقۂ نسواں کو مساوات، وراثت اور طلاق کے حقوق کا ملنا، امریکہ کے سیاہ فام انسانوں کو شرفِ انسانیت کا درجہ حاصل ہونا، دُنیا میں ہر انسان کے لیے تعلیم کا حق تسلیم کیا جانا، حکمرانوں کو قانون کی عملداری کے تحت لانا اور

دیگر بے شمار نعمتوں کا عام ہونا، کیا یہ سب نبیِ عربی کی دعوتِ حق کی صدائے بازگشت نہیں ہے؟ کیا اقوامِ عالم شعوری یا غیر شعوری طور پر رحمتِ عالم کے فیضِ عام سے مستفید نہیں ہو رہی ہیں؟ کیا کوئی ایسی عقلِ ہمہ داں ہے جو اس سارے سلسلۂ خیر و برکت کا صحیح طور پر تخمینہ لگا سکے؟ کیا اس طرح عقل کی نارسائی ظاہر نہیں ہوتی؟ کیا عقل اعمال کی جزا اور سزا کا صحیح اندازہ لگانے کی اہل ہے؟

انسان کے اجتماعی معاملات جن میں عقل کو اپنی جودتِ طبع دکھانے کے مواقع حاصل ہیں، وہاں بھی ضروری نہیں ہے کہ عقل راہِ صواب ہی اختیار کرے۔ ماحول سے متاثر ہو کر، جذبات کی رَو میں بہہ کر، غصّہ، نفرت اور تعصب سے متاثر ہو کر عقل اکثر غلط فیصلے کر ڈالتی ہے۔ عقلِ انفرادی اور عقلِ اجتماعی دونوں نے بارہا ٹھوکریں کھائی ہیں اور صدیوں تک اپنی غلطی پر جمی رہی ہیں۔ اُس دَور میں ان غلطیوں کے خلاف احتجاج کرنے والی ایک آواز بھی بلند نہیں ہوتی۔ کسی باضمیر فرد کے دل میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی۔ ماحول کی سحر آفرینی سے تمام عقلیں ماؤف ہو گئی تھیں اور تمام زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔

ہندوستان میں صدیوں تک شوہر کی موت کے بعد بیوی کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا جاتا رہا۔ شوہر کی لاش کے ساتھ اس کو زندہ جلایا جاتا رہا۔ طبقۂ اچھوت کو انسانیت کے مرتبے سے محروم رکھا جاتا رہا۔ یونان میں ارسطو (۳۸۴ ق۔م تا ۳۲۲ ق۔م) جیسا فلسفی عورتوں اور غلاموں کو انسان سے فروتر درجہ دیتا ہے۔ بُدھ مت کے زیرِ اثر ہندوستان میں اور کیتھولک مذہب کے زیرِ اثر یورپ میں ازدواجی تعلقات کو گندگی قرار دیا گیا جس سے اجتناب کرنا ضروری تھا۔ یہ فیصلے صدیوں نافذ رہے۔ کسی خردمند نے ان کے خلاف زبان نہیں ہلائی۔ حالانکہ آج بالاتفاق مشرق و مغرب کے حکما

اور دانشوران افعال کو غلط اور معاشرہ کے لیے مہلک قرار دیتے ہیں۔ گویا عقل نے صدیوں ٹھوکر کھائی۔

عقلِ اجتماعی کا مظہر جدید دَور میں پارلیمنٹ اور عدالتیں ہیں۔ قومی تعصبات اور ہیجانی کیفیات سے وہ بھی محفوظ نہیں ہیں۔ انسانوں پر سب سے بڑے مظالم میدانِ جنگ کے بعد ایوان ہائے نمائندگان میں اور ایوان ہائے عدالت میں کیے گئے ہیں۔ توسیع پسند امریکی نوآبادکاروں نے پہلے زور اور دھاندلی سے مقامی باشندوں ـــ ریڈ انڈین Red Indians کی زمینوں اور جائدادوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر ان غریبوں کو عدالتی دادرسی سے محروم کرنے کے لیے امریکی صدر اینڈریو جیکسن Andrew Jackson نے ۱۸۳۰ء میں امریکی کانگریس سے یہ ظالمانہ قانون پاس کرا لیا کہ ہنودِ احمر کی گواہی امریکی عدالت میں ناقابلِ قبول ہے۔ اس ایک قانون کے پاس ہو جانے کے بعد ان کے تمام مقدمات خارج کر دیے گئے۔[1] پوری امریکی قوم میں سے کسی زبان اور کسی ضمیر نے اس انتہائی ظالمانہ قانون کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ دینِ مسیح کے رہنما جو انسانی ہمدردی کے جذبہ کے تحت ایشیا اور افریقہ میں انسانوں کو راہِ ہدایت دکھاتے پھرتے ہیں، انھیں اپنے گھر امریکہ میں اس ظلمِ صریح کے خلاف آواز بلند کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔

پُرامن حالات میں بھی عقل قانون سازی کے معاملے میں کچھ زیادہ بہتر رہنما ثابت نہیں ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں امریکی کانگریس نے امتناعِ شراب کا قانون Prohibition Act پاس کیا۔ اس کے نفاذ پر حکومت کی مشینری

---

[1] The Indian Removal Bill The American Heritage Book of Indians, by William Branden, New York 1961

نے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ پروپیگنڈے میں کروڑوں روپے صرف کر ڈالے لیکن امریکی عوام نے ضد میں آ کر پہلے سے زیادہ دوگنی تگنی شراب پینی شروع کر دی۔ بالآخر حکومت نے تنگ آ کر اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا اور ۱۹۳۳ء میں یہ قانون واپس لے لیا۔ کل تک جو شے حرام تھی وہ پھر حلال ہو گئی۔

اہلِ مغرب کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انھوں نے مفتوح قوموں کے خلاف کس قدر بھیانک جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ ان لوگوں کے "کارنامے" کسی طرح قزاقوں سے کم نہیں ہیں۔ لیکن عقلِ اجتماعی یعنی پارلیمنٹ نے ان کی قدر افزائی کی اور ان کو قومی رہنماؤں Heroes کا بلند مرتبہ عطا کیا۔ کلائیو Clive, 1758-1760 وارن ہیسٹنگز Warren Hastings, 1772-1785 اور کارن والس Corn Wallis, 1786-1793 انہی قزاقوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر انگریز قوم نے انھیں قومی ہیرو قرار دیا اور انعامات سے نوازا۔ کیا یہ عقل کا بے لاگ فیصلہ تھا۔

ایک طرف عقل کی بے مائگی کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف حیاتِ انسانی کی وسعت و پہنائی کا وہ عالم کہ زندگی کا ڈرامہ ازل میں شروع ہوا اور ابد تک جاری رہے گا۔ درمیان میں نہایت ہی قلیل وقفہ سے ایک انسان واقف ہوتا ہے

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم (شاد عظیم آبادی)

اِس قلیل سے وقفہ میں عقل کی کہاں تک رسائی ہے؟ یہ بھی ظاہر و باہر ہے اس لیے عقلِ انسانی، معاملاتِ انسانی پر قانون سازی کرنے کی اہل نہیں ہے۔ رہنمائی تو کجا۔

عقل پرستی نے انسان کو کیا دیا؟

عالمِ افکار میں عقل کی بالادستی نے مغربی انسان کو کیا دیا؟ اشرف المخلوقات

کے درجہ سے گرا کر انسان کو حیوان بنا دیا۔ عالمِ غیب کا انکار کر کے محسوسات کے تنگ پنجرے میں اس کو مقید کر دیا۔ حسی لذات سے بلند کوئی مقصد اس کے سامنے نہ رہا۔ غرض و غایت اور منزلِ مقصود سے اس کو محروم کر دیا۔ حیاتِ انسانی کے جہاز کو مادیت کے سمندر میں بہنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ مذہب اور اخلاق کے لنگر سے کٹ کر یہ جہاز مادیت کی تند و تیز موجوں کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ سمندر میں اس کی حیثیت ایک بے بس تنکے سے زیادہ نہیں جو وقت کے دھارے پر چار و ناچار بہا چلا جا رہا ہے۔ نہ منزل کا تعین ہے، نہ ناخدا ساتھ ہے، نہ کارواں کی رفاقت حاصل ہے۔

چلا جاتا ہوں ہوتا ہے جدھر دل کا اِشارہ

نہ منزل ہے کوئی نہ کوئی کارواں میرا

عقل کو مختارِ مطلق بنا دینا اور وحیِ الٰہی کی رہنمائی سے محروم کر دینا، انسانیت کی تاریخ کا بھیانک المیہ ہے۔ انسانیت کے حق میں اس سے بڑی اور کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی۔ دورِ جدید کے ایک بڑے نقاد امریکی صحافی والٹر لپ مین Walter Lippman 1889 کے قلم حقیقت رقم نے دورِ جدید کے انسان کی ذہنی گھٹن اور بے چارگی کا کتنا صحیح نقشہ کھینچا ہے:

"تنہا اپنی ذات پر پہلے کبھی ہم نے اتنا انحصار نہیں کیا تھا۔ آج کوئی ہمدرد ہماری فکر کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی نمونۂ زندگی بلا چون و چرا اطاعت کرنے اور پیروی کرنے کے لیے سامنے موجود نہیں ہے۔ کوئی مافوق شارع نہیں ہے۔ سب عوام الناس ہیں، جن کو دل گداز مصائب اور مشکلات کا سامنا ہے۔ تمام کمزوریاں سطح پر نمایاں ہو گئی ہیں۔ ناقابلِ یافت طبعی قوتیں کبھی خوف زدہ کرتی ہیں اور کبھی ڈھارس بندھاتی ہیں۔

"فی الحقیقت ہماری ثقافت گنجلک ہے۔ ہماری تہذیب ہنگامی ہے۔ ہمارے جذبات جامے سے باہر ہو رہے ہیں۔ کسی ملاح نے شاید ہی کبھی ایسے

نا آشنا سمندر میں جہاز رانی کی ہو' جیسی کہ بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے انسان کو کرنی پڑ رہی ہے۔ ہمارے اسلاف سمجھتے تھے کہ وہ اپنا راستہ پیدائش سے لے کر موت تک جانتے ہیں۔ لیکن ہم پریشان ہیں ہمیں کل کے بعد آنے والے دن کی بھی خبر نہیں۔

"مذہب سے آزادی حاصل کرنے کے بعد سے یہ تمام مصیبتیں شروع ہوئی ہیں۔ آزادی ایک دل خراش چیلنج ہے۔ یہ انسان کو رہبر کی رہنمائی سے اور پادری کی طمانیت سے محروم کر دیتی ہے۔ مذہب کے بت کو پاش پاش کرنے والوں نے ہمیں آزاد نہیں کیا، بلکہ درحقیقت سمندر کی موجوں میں پھینک دیا۔ اب ہمیں خود ہی ہاتھ پیر مارنے ہیں۔"

ایک دوسرے مغربی مفکر کا اعترافِ حقیقت سنیئے' لارڈ لوتھین Lord Lothian نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے اجتماع ۱۹۳۸ء کے موقعہ پر ایک پرمغز خطبہ دیا تھا۔ اس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ:

"اس وقت یورپ روحانی اعتبار سے مُردہ ہے' اخلاقی اعتبار سے مریض ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے سخت اضطراب میں ہے۔ وہ تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ وہ اپنی اجتماعی زندگی کے کسی مسئلہ کو تسلی بخش طریقے سے حل نہیں کر سکتا۔ وہ اس وقت ایک ایسے نظامِ حیات کی تلاش میں ہے جو اس کے روحانی، اخلاقی، سیاسی، معاشی اور عمرانی مسائل کا تسلی بخش حل پیش کرسکے۔"

ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال (۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۸ء) نے اہلِ مغرب کی مشکلات و مصائب کا تذکرہ اپنے حکیمانہ انداز میں اس طرح کیا ہے ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

Drift and Mystery, by Walter Lippman, pages 196—197

(جاری ہے)

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

عقل کا صحیح مقام

عقل خلق اللہ ہے، مظاہرِ فطرت سے استنباطِ حقائق کرتی ہے۔ وحی کلام اللہ ہے، براہِ راست خالقِ کائنات سے علم حاصل کرتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان تصادم اور تناقض کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں ہے۔ اگر کہیں ایسا فی الواقع ہو رہا ہے تو یا تو عقل کی نافہمی اور کوتاہ دامنی ہے یا نصوص وحی کے سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ قانونِ الٰہی کی بنیادیں اگرچہ عقل کی رسائی سے ماورا ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ محال یا خلافِ عقل ہیں۔ ان کو قبول کرنے میں عقل کو استبعاد ہے۔ دورِ جدید کا سب سے بڑا سائنس دان آئن سٹائن لکھتا ہے:

"یہ اقدار (مذہبی احکام) تجربات کے بعد وضع نہیں کی گئی ہیں بلکہ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی و الہام حاصل ہوتی ہیں ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہے۔ تاہم وہ تجربہ کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں، اس لیے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربات سے درست ثابت ہو۔"

اسی سلسلے میں ہندوستانی کمیشن کے ممبروں نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے:

"قوموں کو تاجر یا سیاست دان تشکیل نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ قوموں کو مفکر،

(گزشتہ سے پیوستہ)

١ منقول از مضمون "اسلام کو چیلنج" از یوسف سلیم چشتی۔ ماہنامہ میثاق لاہور اپریل ۱۹۷۴ء

٢ ایمان۔ وحی الٰہی ٣ ہدایتِ الٰہی

١ Out of My Later Days, by Einstein New York

فلاسفہ اور مذہبی رہنما تشکیل کرتے ہیں۔ اِس لیے کہ قومی وحدت اور قومی ترقی کے لیے تجارتی اداروں اور سیاسی تنظیمات سے عمیق تر بنیادیں درکار ہوتی ہیں۔[1]

وحی سے حاصل شدہ افکار و تصورات میں انقلاب انگیزی اور مردم سازی کی بڑی غیر معمولی قوت پنہاں ہوتی ہے۔ ان کی اثر آفرینی خشک فلسفیانہ افکار سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے۔ یہ افکار صدیوں تر و تازہ رہتے ہیں، اور لاکھوں کروڑوں افراد کی زندگیاں ان سے اثرات قبول کر کے سُدھرتی اور سنورتی رہتی ہیں۔ اس کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں :

"تجربہ بتاتا ہے کہ عقل کے ذریعہ حاصل شدہ صداقت دِلوں میں وہ زندہ ایمان پیدا کرنے سے قاصر ہے جو وحی و الہام کے ذریعہ حاصل شدہ صداقت پیدا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجرد افکار زندگی پر بہت کم اثر انداز ہوئے ہیں لیکن مذہب نے افراد کو رفعتِ اخلاق تک پہنچا دیا اور معاشروں کو تبدیل کر ڈالا۔"[2]

یونان کے فلسفیوں نے اصلاحِ معاشرہ کی کوشش کی، مگر سب ہی ناکام ہوتے۔ سقراط نے مجرد عقل کے ذریعہ یونانی معاشرہ کی برائیوں کی اصلاح کرنا چاہی۔ اس نے اعلان کیا کہ علم نیکی ہے۔ مگر وہ اس مہم میں ناکام ہوا، بلکہ اپنی جان بھی کھو بیٹھا۔ اس کے شاگرد افلاطون Plato کو ۳۶۷ ق۔م میں سارا کیوز Syracuse کے بادشاہ ڈیکن Dacon نے طلب کیا اور کہا کہ وہ ریاست میں اپنے نظریات کے مطابق نظامِ تعلیم چلائے۔ "مثالی جمہوریت" کے مصنف افلاطون کو اپنے نظریات کو رُوبعمل لانے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ مگر وہ وہاں سے بُری طرح ناکام ہو کر لوٹا۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو تھا۔ شاہزادہ

---

[1] The Report of University Commission India page 55

[2] "اسلامی افکار کی تشکیل جدید" از علامہ اقبال ترجمہ چودھری نیاز احمد، لاہور صفحہ ۲۱

اسکندر کی تعلیم و تربیت شروع سے ارسطو کے سپرد تھی۔ دُنیا جانتی ہے کہ اسکندر بڑا ظالم اور بد کردار حکمران تھا۔ اس نے ارسطو کی تعلیم کا کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ دُنیا نے دیکھ لیا کہ دُنیا کے تین بڑے فلسفی عقل کے بل بوتے پر معاشرہ کی اصلاح میں سخت ناکام ہوئے، اور دُنیا یہ بھی جانتی ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی اصلاح کا اثر صدیاں گزر جانے کے بعد آج تک قائم ہے۔ وحی کے مقابلہ میں مجرد عقل کی ناکامی کا یہ واضح ثبوت ہے۔ اِس لیے عقل کے لیے صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ وہ وحیٔ الٰہی کی رہنمائی قبول کرے اور پھر اس کی روشنی میں اپنا فریضہ انجام دے۔ وحیٔ الٰہی سے منہ موڑ کر اور مختارِ مطلق بن کر عقل نے ہمیشہ خسارہ اُٹھایا ہے۔ ؎

وہ علم کم بصری، جس میں ہم کنار نہیں
تجلیاتِ کلیم[1] و مشاہداتِ حکیم[2]

مغربی نظامِ تصورات جن بنیادوں پر تعمیر ہُوا ہے، ان کا مختصر سا تذکرہ صفحاتِ بالا میں پیش کیا جا چکا ہے۔ نقد و نظر کی کسوٹی پر یہ تصورات حقیقت و صداقت ثابت نہ ہو سکے، جیسا کہ ان کے متعلق اہلِ مغرب کا دعویٰ رہا ہے۔ فی الحقیقت یہ چند مزعومہ تصورات ہیں جن کو نشۂ کامرانی نے حقائق کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ غلبۂ اقوام اور مادی کامرانی کی صہبائے تند و تیز کا نشہ دِل و دماغ پر اس درجہ حاوی تھا کہ ادراکِ حقیقت سے اس وقت کے اذہان قاصر رہے۔ اساس و بنیاد کے نقص اور فتور کو ظاہر ہوتے ہوتے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ عمرانی دنیا میں نتائج فوری طور پر ظاہر نہیں ہوتے۔ اب نتائج ظاہر ہونے شروع ہو رہے ہیں آج ان افکار و تصورات کی ہلاکت خیزیاں عیاں ہو رہی ہیں۔ آج ہر چشم بینا اور ذہن رسا اس صورت پر ماتم کناں ہے۔ مگر کچھ لوگ ہیں کہ جن کی آنکھیں ظاہری چمک دمک سے خیرہ ہو چکی ہیں، جن کی بصارت ماؤف ہو چکی ہے، وہ بدستور بدمستی میں مگن ہیں۔ وہ نیند کے ماتے ابھی نہیں چونکے۔

---

[1] کلیم = نبی و رسول

[2] حکیم = فلسفی و سائنسداں

پانچواں باب

لادینی نظریات میں تزلزل

لادینی نظریۂ حیات اور مشینی تصورِ کائنات کے خلاف بیسویں صدی کے آغاز سے ہی مخالفانہ صدائیں بلند ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ کائنات کو خود بخود چلنے والی مشین قرار دینے والا نظریہ مزید تحقیق و تدقیق کی روشنی میں قابلِ قبول نہ رہا۔ معروضی علوم Objective Sciences یعنی ریاضی اور طبعی علوم میں انکشافِ حقائق کی رفتار قدرے تیز رہی ہے۔ ان انکشافات نے مشینی نظریہ کے خلاف کافی مواد جمع کر دیا۔ نصف صدی سے زائد زمانہ گزر جانے کے بعد یہ مواد اتنا وزن دار ہوگیا کہ سائنس دانوں کا ایک گروہ اس اختلافِ نظر کو قبول کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ بھی ان تحقیقات کے نتائج کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔

گزشتہ تین صدیوں سے مادہ پرستی اور لادینیت کی علم برداری نے جو ذہنی اور فکری فضا مغرب میں قائم کر دی ہے، وہ حقائق کی غیر مادی تعبیر قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اس باعث اپنی تحقیقات کے نتائج کا کھلے دل سے اعتراف اور اعلان کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔

مے خانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

جن حکماء اور سائنس دانوں کے ہاتھوں مادیت کے قصرِ رفیع میں تزلزل آیا ہے اور طلسمِ میکانیت ٹوٹتا نظر آرہا ہے، ان کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے تاکہ مادی فکر کی غلطیاں ظاہر ہوں:

۱۔ تخلیق میں ماحول بے اثر

ویز مین Weis Mann, 1834-1914 (جرمنی) نے انکشاف کیا کہ اوّل جرثومۂ حیات Gene میں کسی طرح کوئی تغیر و تبدل نہیں لایا جاسکتا۔ اس سے قبل ڈارون نے عملِ تخلیق میں ماحول کے تغیر کو زبردست عامل قرار دیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ ماحول کے تغیر کے بعد ہی نئی انواع ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ سب دعوے غلط ثابت ہوئے۔

۲۔ کائنات فانی ہے

بولٹز مین Boltsman, 1844-1960 (آسٹریا) نے حرارتی حرکیات Thermo-Dynamics کے دوسرے قانون کے ذریعہ یہ بات قطعی طور پر ثابت کر دی کہ سورج کی حرارت بتدریج کم ہو رہی ہے جس سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ گھٹتے گھٹتے ایک دن سورج بے نور ہو جائے گا اور یہ کائنات فنا ہو جائے گی۔ جو لوگ مادہ اور توانائی کی بقا کے دعوے دار تھے اب ان کی پوری طرح تردید ہوگئی۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آج سے دس کروڑ سال بعد سورج مدھم پڑ کر پھیلنا شروع کر دے گا۔ قریب کے سیارے یعنی مریخ، زمین اور زہرہ وغیرہ اس میں جذب ہو جائیں گے اور اس طرح وہ سیارے فنا ہو جائیں گے پھر سورج سکڑنا شروع کر دے گا۔ اور بتدریج ٹھنڈا پڑتا چلا جائے گا اور یہ کائنات فنا ہو جائے گی۔ چودہ سو سال بیشتر قرآن مجید اس حادثہ کی اطلاع دے چکا ہے۔ قربِ قیامت کی علامت یہ ہے کہ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ۔ (سورۃ قیامت۔ ۹) "چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں گے۔"

۳۔ ذہن غیر مادی

آلیور لاج Oliver Lodge, 1857-1940 (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ ذہن انسانی غیر مادی ہے جو ایک

مُدت کے لیے انسانی دماغ میں اپنا گھر بنا لیتا ہے اور موت کے بعد آزاد ہو جاتا ہے۔ اس نے رُوحِ انسانی کے غیر مادی ہونے اور باقی رہنے کا تصوّر پیش کیا۔

Max Plank, میکس پلانک

۴۔ اشیاء کی ذاتی صفات کا اِنکار

1858-1947 (جرمنی) نے دعویٰ کیا کہ اشیاء کی صفات ذات سے جدا ہیں۔ صفات ذات کا جزو نہیں ہیں۔ اس تحقیق سے مشینی تصورِ کائنات پر زد پڑتی ہے۔

۵۔ مادّی تغیّرات غیر تدریجی

میکس پلانک نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اشیاء میں تغیّرات تدریجی طور پر نہیں واقع ہوتے ہیں جیسا کہ مشینی نظریہ کا تقاضا ہے، جس کا سب سے بڑا دعوے دار نیوٹن تھا۔ میکس پلانک کہتا ہے کہ اسباب کی ایک معین مقدار جمع ہو جاتی ہے، تب نتائج یا تغیرات رُونما ہوتے ہیں۔ اس کو وہ نظریہ مقادیر Quantum Theory کہتا ہے۔

White Head, 1861-1947 وہائٹ ہیڈ

۶۔ ذرّات نہیں وقوعات

(انگلستان) نے ثابت کیا کہ ابتدائی ذرّات Atoms ٹھوس اور جامد نہیں ہیں، جیسا کہ مادیت کے علمبرداروں کا دعویٰ ہے۔ بلکہ وہ ہر دم متغیر ہیں۔ اِس لیے ان کو وقوعات Events کہنا زیادہ صحیح ہو سکتا ہے۔

Thomas Morgan, تھامس مارگن (امریکہ)

۷۔ اِرتقاءِ فجائی

نے دعویٰ کیا کہ ایک سطح سے دُوسری سطح پر عملِ ارتقا جست لگا کر ہوتا ہے، بتدریج نہیں ہوتا جیسا کہ ڈارون کا دعویٰ ہے۔ اس کو وہ فجائی ارتقاء کا نام دیتا ہے۔

Arthur Keith, آرتھر کیتھ

۸۔ نظریہ ارتقا ناقابلِ ثبوت

1866-1956 (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ محض اتنی سی بات نہیں ہے کہ نظریہ ارتقا غیر ثابت شدہ ہے بلکہ آئندہ بھی وہ ناقابلِ ثبوت رہے گا۔ لیکن ہم اس نظریہ کو اس وجہ سے مانتے ہیں کہ اس کا متبادل نظریہ یعنی تخلیقِ خداوندی ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہے۔

Ruther Ford, 1871-1937 رُتھر فورڈ

۹۔ مادّہ فانی

(نیوزی لینڈ) نے سب سے پہلے جوہر کو شکست کیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس شکست کے بعد مادہ کا وجود باقی نہیں رہتا۔ جوہر فانی ہے۔

پروفیسر روگیر T. Roughier نے لکھا ہے کہ مادہ کی قدامت کے دور میں یہ مقولہ تھا "نہ کوئی چیز پیدا ہوتی ہے نہ کوئی چیز فنا ہوتی ہے۔" لیکن اب یہ مقولہ اس طرح ہو گیا ہے۔ "کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، ہر چیز فنا ہو جاتی ہے"[1]

W. James Jeans, -1947 ولیم جیمس جینز

۱۰۔ کائنات آفاقی ذہن کا مظہر

(انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ یہ طبعی دُنیا کسی آفاقی ذہن کا مظہر ہے۔ کائنات کے پس پردہ کسی عظیم الشان ریاضی داں ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہ پہلا سائنسداں ہے جس نے جُرأت کر کے اقرار کیا کہ کائنات کسی ریاضی داں ذہن کی تخلیق ہے۔ ورنہ اب تک تو یہی بات دہرائی جا رہی تھی کہ سب کچھ فطرت ہے۔

Einstein, 1879-1955 آئن سٹائن

۱۱۔ قانونِ تجاذب کا اِنکار

(جرمنی) نے ثابت کیا کہ دُنیا میں قانونِ تجاذب Law of Gravity کا کوئی وجود نہیں ہے۔ حالانکہ یہ قانونِ مشینی نظریہ کا اہم ستون ہے۔ نیوٹن نے اس کو دریافت کیا تھا۔ ۱۷۰۵ء میں پہلی مرتبہ

---

[1] Philosophy and New Physics, by T. Roughier, Translated by Morton, p. 150

آئن شٹائن نے نظریۂ اضافیت پیش کیا تھا، جس نے طبیعیات میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔

۱۲۔ مادّہ اور توانائی کی دوئی ختم

آئن شٹائن نے ثابت کیا کہ مادّہ اور توانائی دو جُدا جُدا اکائیاں نہیں ہیں جیسا کہ یونانیوں کے زمانہ سے دعویٰ کیا جاتا رہا ہے، بلکہ یہ ایک ہی شے کے دو مظہر ہیں۔ اس کی زد مشینی نظریہ پر پڑتی ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

"اسلام کے نقطۂ نگاہ سے مادّہ رُوح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیدِ زمان و مکاں میں ہوتا ہے۔ مغرب نے مادّہ اور رُوح کی تقسیم کا تصوّر مانویت کے زیرِ اثر بلا کسی تجزیہ کے قبول کر لیا ہے۔"[1]

۱۳۔ کمیت و مقدار اضافی

آئن سٹائن نے ثابت کیا کہ اشیاء کی مقدار اور کمیت کا مستقل وجود نہیں ہے، بلکہ حرکت اور سکون اور خفت اور سرعت رفتار کے ساتھ ساتھ اشیاء کی مقدار بھی بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔

۱۴۔ زمان و مکان اضافی

آئن شٹائن نے اپنے مشہور نظریہ اضافیت کے ذریعہ ثابت کیا کہ زمان و مکان کا مستقلاً کوئی وجود نہیں ہے، بلکہ اشیاء کی خفت اور سرعت رفتار کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں علامہ اقبالؒ کا شعر یاد آجاتا ہے۔

خرد ہُوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
زماں ہے نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ

---

[1] خطبۂ صدارت۔ سالانہ اجلاس مسلم لیگ منعقدہ الٰہ آباد۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء

۱۵۔ اصل حقیقت ذہن

ایڈنگٹن Eddington, 1882-1944 (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ کائنات کی اصل حقیقت معروضی Objective نہیں ہے، بلکہ صراحۃً ذہنی Subjective ہے۔ کائنات کی اصل حقیقت ذہن ہے۔

۱۶۔ اصل معلوم ذہن

ایڈنگٹن نے دعویٰ کیا کہ براہِ راست تجربہ میں آنے والی واحد شے ہمارا ذہن ہے۔ باقی ساری دُنیا ہمارے ذہن کا اِستنباط Deduction در استنباط ہے۔ یہی بات بشپ برکلے (۱۶۸۸ء تا ۱۷۵۳ء) بہت پہلے کہہ چکا تھا۔ اس وقت کسی نے اس کی بات کی طرف توجہ نہیں کی۔

۱۷۔ کائنات ذہن کی پیداوار

ایڈنگٹن نے دعویٰ کیا کہ زندگی کا جو ڈراما شب و روز ہمارے سامنے کھیلا جا رہا ہے۔ وہ سب کا سب ہمارے ذہن کی تعبیر و ترجمانی ہے، یعنی حقائق کو یہ جامۂ زیبا ہمارے ذہن نے عطا کیا ہے۔ عُریاں حقائق کیا ہیں، اس کی کسی کو خبر نہیں ہے۔ یہ باتیں سُن کر ایسا لگتا ہے کہ کوئی سائنس داں نہیں، بلکہ کوئی فلسفی بول رہا ہے۔

۱۸۔ ذہن صاحبِ بصیرت

وُلف گانگ کوہلر Wolf Gong Kohler, 1887- (جرمنی) نے دعویٰ کیا کہ ذہن احساسات، جذبات اور ادراکات کا مجموعہ نہیں ہے، جیسا کہ کرداریت Behaviourism کے ماننے والوں کا دعویٰ ہے۔ بلکہ ذہن خود صاحبِ بصیرت ہے۔ اس کو پہلے کُل کا شعور ہوتا ہے۔ پھر اس کی روشنی میں وہ جزئیات کا شعور حاصل کرتا ہے۔ گویا ذہن کا طریقۂ کار عالمِ مادّی دُنیا کے طریقۂ کار سے مختلف ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہُوئے کہ ذہن انسانی مادّہ سے جداگانہ نوعیت کی شے ہے۔ اس بنیادی اصول سے نفسیات

کا نیا دبستان School پروان چڑھتا ہے جس کو Gestalt School of Psychology کہتے ہیں۔

۱۹۔ کائنات کی تخلیق دھماکہ سے

جارج گیمو George Gaimo (امریکہ) نے دعویٰ کیا کہ کائنات ایک دھماکے کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کائنات لفظ "کُن" کے کہنے سے وجود میں آئی ہے۔ اس طرح یہ مذہب کے نقطۂ نظر سے بہت زیادہ قریب آگیا ہے۔

۲۰۔ علّت و معلول کا لزوم ختم

ہیزن برگ Heisen Berg, 1901 (جرمنی) نے ثابت کیا کہ مظاہرِ فطرت میں علت و معلول کا جبری لزوم نہیں ہے جیسا کہ نیوٹن کا دعویٰ تھا۔ بلکہ یہاں عدم تعیّن کا طریقۂ کار جاری ہے۔ اس کی زد مشینی نظریہ پر براہِ راست پڑتی ہے۔ بہت پہلے ڈیوڈ ہیوم علّت و معلول کے درمیان جبری لزوم کی تردید کر چکا تھا۔ اب سائنس دانوں نے بھی اس کی بات تسلیم کر لی ہے۔

۲۱۔ سائنس دان شاعر

فلپ فرینک Phillip Frank (امریکہ) نے دعویٰ کیا کہ بنیادی طور پر سائنس دان کا کارنامہ شاعر کے کارنامے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ سالم حقیقت کی گرفت نہ سائنس داں کو حاصل ہے اور نہ شاعر کو۔ گویا اب سائنس داں بھی تخیل آرائی Speculation کرتے نظر آتے ہیں اور اس حیثیت سے شاعر کے ہم پلّہ بن گئے ہیں۔

۲۲۔ توحید اوّلین اعتقاد

پروفیسر شمٹ Prof. W. Schmidt (آسٹریا) کی تحقیقات کے مطابق اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران و تمدّن کی "اعلیٰ ترین ہستی" فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا، اور انسان کا دینی عقیدہ جو

اس سے ظہور پذیر ہوا تھا، وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔ یہ حقیقت اب اس درجہ نمایاں ہو چکی ہے کہ ایک سرسری تحقیق بھی اس کے لیے کفایت کرتی ہے۔[1] قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت نہیں رہی) ان میں اختلافات رُونما ہوئے۔ تب اللہ نے نبیوں کو بھیجا۔" (البقرہ-۲۱۳)

ایک دُوسرے جرمن محقق عمر اہرن فیل Dr. Umar Rolf Baron Ehranfels آسٹریا، لکھتا ہے:

"ثقافتی تاریخ انسان کا بشریاتی Ethnological مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جمعیتِ انسانی کا پہلا مذہب توحیدی تھا۔ اور قدیم ترین جنگلی قبائل، جن کا مادی اثاثہ حد درجہ قلیل ہے، ان کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے۔"[2]

اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ اوّل انسان موحد تھا با اخلاق تھا، پھر اس نے وحشت اور بربریت اختیار کی ہے۔ یہی قرآن کا بیان ہے۔

۲۳۔ استقرائی طریقہ ناکام

راجر بیکن Roger Bacon, 1214-1294 (انگلستان) نے نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں سائنسی تحقیقات کے لیے استقرائی طریقہ Inductive Method دریافت کر کے عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہ سائنس کا مخصوص طریقۂ کار بن گیا تھا۔ سائنس کی تمام ایجادیں اسی طریقۂ کار کی رہینِ منت ہیں، مگر اب بیسویں صدی کے سائنس دان اس طریقۂ کار کو ترک کر رہے ہیں۔

---

[1] The Origin and Growth of Religion (1912)

بحوالہ ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۲۸

[2] Islamic Culture (Magazine) Hyderabad Deccan, etc. 1944 p. 446

Epistemological علمیاتی طریقہ

۲۴۔علمیاتی طریقہ کامیاب

Method فلسفیوں کے یہاں

مستعمل تھا۔ اب سائنس داں اس طریقۂ کار کی برتری کے قائل ہو گئے ہیں، اور چوٹی کے سائنس داں اس کو استعمال کر رہے ہیں۔

میکس پلانک نے ۱۹۰۰ء میں مشہور نظریہ مقادیر Quantum کا انکشاف اسی طریقہ کو استعمال کر کے کیا تھا۔

آئن شٹائن نے ۱۹۰۵ء میں اپنا مشہور نظریۂ اضافیت Relativity علمیاتی طریقہ سے دریافت کیا تھا۔

اس طرح سائنس دانوں نے اپنا طریقۂ کار ترک کر دیا ہے اور فلسفیوں کا طریقۂ کار اختیار کر لیا ہے۔ اب سائنس اور فلسفہ میں طریقۂ کار کی جدائی بھی باقی نہیں رہی۔

سائنس کے جدید تصورات

اسلامی ہندوستان کے مایہ ناز سائنس دان ڈاکٹر جسٹس سر شاہ سلیمان نے شملہ میں (۱۹۳۸) میں تقریر کرتے ہوئے جدید دور میں مادہ کی حقیقت کو یوں سمجھایا تھا۔

"سائنس کے تمام نظریات محض قیاسات ہیں۔ انسان صرف قیاس ہی کر سکتا ہے وہ بھی شروع میں لازمی طور پر غلط اور نامکمل ہوتے ہیں۔ اس کو وسیع تر تجربوں سے اپنی غلطیاں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ غلطیاں معلوم ہو جانے کے بعد وہ ایک قیاس کو چھوڑ کر دوسرا قیاس کر لیتا ہے۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے کیونکہ فطرت کے حقائق اس کی دسترس سے باہر ہیں"۔

"ہمارے تخیلات ناقص، نامکمل اور ادھورے اور ہمارے نظریات محض قیاسات رہیں گے۔ ہمارے خیالات بہت دور تک پہنچ سکتے ہیں لیکن

ہمارے مشاہدات ان کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں۔ اس لیے سائنس کی تحقیقات ہر زمانہ میں غیر اصلی رہیں گی"۔

"سائنس کے جدید نظریوں میں مادہ غیر اصلی چیز ہے۔ محسوسات غیر محسوسات میں، حقیقت غیر حقیقت میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ مادہ ایک لامتناہی لہروں کی جماعت سمجھا جاتا ہے۔ جو لامتناہی طور پر پھیلتا جاتا ہے۔ اور جب کسی مادہ سے ملتا ہے تو سمٹ کر ایک نقطہ پر آجاتا ہے۔ یہ لہری قوتیں توانائی Energy کی لہریں نہیں ہیں لیکن ان کو ریاضی اور سائنس کی اصطلاح میں مختلف ناموں سے منسوب کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ کوئی حقیقی لہریں نہیں ہیں بلکہ خیالی، مصنوعی اور علامتی لہریں ہیں اس لیے مادہ بھی ایک خیالی لہر کی تصویر ہے۔ جن کو ریاضی کے نشانات میں ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کا تصور ذہن میں نہیں آسکتا۔ اور چونکہ یہ محض خیالی ہیں اس لیے فضا اور وقت میں ان کی جگہ بھی متعین نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس طرح موجودہ سائنس کائنات کی ہر چیز کی ایک خیالی تصویر پیش کر رہا ہے جس کا دیکھنا تو کیا ذہن میں تصور قائم کرنا بھی ناممکن ہے۔"

شعور کی حقیقت

انسانی ذہن کائنات کی کل تصویر جاننا چاہتا ہے۔ وہ جزئی معلومات کی گٹھڑی پر قناعت نہیں کر سکتا۔ مواد کافی ہو یا ناکافی، آغاز سے انسان نے کائنات کے متعلق ایک جامع اور مربوط تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کہیں دیومالا کے قصے ہیں اور کہیں فلسفیوں کے نظامِ فکر ہیں۔ سائنس داں بھی اسی

درسالہ معارف اعظم گڑھ نمبر ۲ جلد ۴۲ ص ۱۴۱۔ اگست ۱۹۳۸ء

ذہنی افتادِ طبع سے مجبور ہیں کہ کائنات سے متعلق جو جزئی معلومات کا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا ہے، وہ ان سب کو سامنے رکھ کر اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کوشش میں تخیل آرائی اور ذہنی پرواز سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ اگرچہ ماضی میں وہ تخیل آرائی کے خلاف جنگ لڑ چکے ہیں۔ اس صدی میں سائنس داں بھی فلسفہ آرائی کرتے نظر آتے ہیں۔ اب سائنس داں مادہ Matter کے بجائے تصور Idea کو موضوعِ بحث بنا رہے ہیں اور اصل حقیقت مادہ کو نہیں مانتے بلکہ شعور کو مانتے ہیں۔ اس قسم کی فلسفہ طرازی کے چند نمونے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ مادّہ شعور سے ماخوذ — میکس پلانک Maxplank, 1855-1944 (جرمنی) کہتا ہے کہ میرے نزدیک اس کائنات کی اصل حقیقت Reality شعور Mind ہے۔ مادّہ کا مستقل کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کے خیال کے مطابق مادّہ کا وجود شعور سے ماخوذ ہے۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔ ع

ارتباطِ حرف و معنی، اختلاطِ جان و تن

۲۔ شعور اساسی حقیقت — جیمس جینز James Jeans, 1878-1947 (انگلستان) کہتا ہے کہ میرا ذاتی رجحان اس نظریہ کی طرف ہے کہ شعور کائنات کی اساسی حقیقت ہے۔ یہ مادی کائنات شعور سے ماخوذ ہے۔

۳۔ نفس اور شعور اساسی حقیقتیں — آئن شٹائن کہتا ہے کہ میری رائے میں نفس Psychic اور شعور Mind کائنات کی اساسی حقیقتیں ہیں۔

۴۔ ایغو حقیقت — اڈنگٹن کہتا ہے کہ باطنی ایغو Internal Ego کسی طرح بھی کائنات کا جزو

نہیں بن سکتی۔ یعنی شعور مادی کائنات کا جزو نہیں ہے۔

۵۔ شعور کی توجیہہ ناممکن — پروفیسر شروڈنگر Schrodinger, 1887 (آسٹریا) کہتا ہے کہ انسانی شعور کی تحلیل و توجیہہ Analysis and Interpretation طبعی طریقوں سے ممکن نہیں ہے۔

پروفیسر شروڈنگر کو ۱۹۳۳ء میں طبعیات میں نوبل پرائز ملا تھا۔

۶۔ شعور کی حیاتیاتی توجیہہ ناممکن — پروفیسر ہالڈین J. B. Haldane, 1892 (انگلستان) کہتا ہے کہ شعورِ انسانی کی حیاتیاتی توجیہہ میں ہم ناکام رہے ہیں۔

حقیقت الحقائق

اس کائنات کی حقیقت الحقائق کیا ہے؟ ابتدائے آفرینش سے یہ سوال نوعِ انسانی کے سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کے سامنے رہا ہے۔ قدیم زمانہ میں فلسفیوں کے یہاں اس سوال سے متعلق کثیر بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ کے حکماء اور فلاسفہ نے اس سوال سے بالکل روگردانی اختیار کر لی تھی۔ وہ مادیت سے باہر نہیں جھانکنا چاہتے تھے۔ مگر اس سوال نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ پوری شدت کے ساتھ یہ سوال پھر مفکرین کے سامنے اُبھر کر آ گیا ہے۔ اب وہ اس سے کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ مجبوراً انھیں اس اہم سوال کے متعلق لب کشائی کرنی پڑی ہے۔ انھوں نے چند جوابات دیے ہیں۔ بعض نقطۂ نظر سے یہ جوابات ناقص ہیں، لیکن ایک بات جو ان جوابات

---

[1] فلسفیانہ آرا اور سائنسی افکار کا ماخذ عموماً "مذہب اور سائنس" از مولانا عبدالباری ندوی (متوفی ۱۹۷۵ء بعمر ۹۴ سال) ہے۔ مکتبہ رشیدیہ لاہور ۱۹۷۴ء، صفحہ ۱۹۹

سے واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سائنس والوں کا مطمعِ نظر اب مادیت اور میکانیت سے بہت ورا الورا ہے۔ سترھویں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کے سائنس دانوں سے ان کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ حقیقت کا جس قدر ادراک وہ کر چکے ہیں اس کا واضح الفاظ میں اظہار کرتے ہوئے وہ جھجکتے ہیں۔ اظہارِ بیان میں ایسے الفاظ تلاش کرتے ہیں جو مادہ پرست مغربی ذہن کو زیادہ اجنبی نظر نہ آئیں، زیادہ ناگوار نہ گزریں۔ اظہارِ حقیقت کی ایسی چند کاوشوں کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا:

۱۔ حقیقت ارادۂ ازلی ہے

شوپن ہار Schopen Hauer, (جرمنی) نے دعویٰ کیا کہ ایک قسم کا اندھا آفاقی ارادہ Voluntarism حقیقتِ ازلی ہے۔

۲۔ جذبۂ تخلیق

ہنری برگساں Henri Bergson, 1859/1941 (فرانس) کا دعویٰ ہے کہ کائنات میں عملِ تخلیق بڑے عظیم الشان پیمانے پر جاری و ساری ہے۔ اس کے پس پردہ محرک کو وہ "جذبۂ تخلیق" Elan Vital کا نام دیتا ہے۔ اس کو محض جذبہ قرار دینا کافی نہیں ہے۔ تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ صاحبِ تخلیق صاحبِ شعور اور صاحبِ ارادہ ہو۔

۳۔ رُوحِ کائنات

ڈریش Driesche, 1867- (جرمنی) کا دعویٰ ہے کہ اس مادی کائنات میں کارفرما قوت کو "رُوح" Entelechy کہنا چاہیے۔

۴۔ ریاضیاتی ذہن

جیمس جینز کا دعویٰ ہے کہ اس مادی کائنات کے پس پردہ کارفرما قوت کوئی ریاضیاتی ذہن ہے۔ جس نے اس کائنات کو ریاضی کے قوانین کے مطابق بنایا ہے۔

۵۔ ذہنی ہیولیٰ

ایڈنگٹن کا دعویٰ ہے کہ مادی کائنات میں اثرانداز قوت ذہن جیسا مواد رکھتی ہے Mind Stuff

اس کا حجاب مانع آ رہا ہے۔ وہ اس قوت کو ذہن کہنے سے بھی گریز کر رہا ہے۔

۶۔ تخلیقی اصول

لائڈ مارگن Loyd Morgan (امریکہ) نے دعویٰ کیا ہے کہ اس مادی کائنات میں ایک تخلیقی اصول ازلی ابدی Timeless ہے۔

علمی اور فکری دُنیا میں اب مادیت اور میکانیت کے خلاف آئے دن صدائے احتجاج بلند ہوتی رہتی ہے، اور کسی قدر نقطۂ نظر میں تبدیلی بھی آئی ہے مگر اس کا دائرۂ اثر بہت محدود ہے۔ ورنہ مجموعی حیثیت سے وہی قدیم لادینی مادی فضا غالب ہے۔ چند سائنس دانوں اور حکماء کو مستثنیٰ قرار دے کر مغرب میں فکر و نظر کا قافلہ بدستور مادہ پرستی اور خدا بیزاری کی راہ پر گامزن ہے۔ سازِ مغرب میں وقتاً فوقتاً اضطراب اور بے آہنگی کے آثار ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ مادی تعبیر و تاویل کرنے میں صدیوں کی مشق کے بعد اب مغربی ذہن مشاق ہو چکا ہے۔ صورتِ حالات میں جزوی ردوبدل پر وہ ذہن کو مطمئن کر لیتا ہے غلطیاں اساسی ہیں۔ ان کا اعتراف کرنے کی جسارت ابھی مغربی مفکرین کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اہلِ مغرب کا قافلہ لادینیت کی راہ پر اتنی دُور نکل گیا ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا اس کے لیے اب بہت دُشوار ہو گیا ہے عہدِ آغاز کی غلطیوں اور غلط کاریوں کا ادراک کرنے سے وہ قاصر ہے۔ ابھی تک خوش فہمی کی فضا پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ کسی حادثۂ فاجعہ سے دوچار ہونے کے بعد شاید تنبیہہ حاصل ہو جائے۔

صورتِ حال کی اصلاح

جدید دور کے بعض دیدہ ور مفکرین پر مغربی تہذیب کی فطرتِ انسانی سے ناسازگاری پوری طرح عیاں ہو چکی ہے۔ مادی آسائشوں کے پردے میں اس

تہذیب نے انسانیت کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے ہاتھوں انسانیت کی خوب تذلیل ہوئی ہے۔ انھیں اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہے۔ کہ یہ نتائج بد ان ابتدائی غلطیوں کا ثمرہ ہیں، جنھیں نشأۃ ثانیہ کے بعد یورپ کے جدید معاشرہ نے اپنا لیا تھا۔ نوبل انعام یافتہ الیکسس کیرل Alexis Carrel اپنی کتاب "انسان مجہول" Man the Unknown میں لکھتا ہے:

"جدید تہذیب اپنے آغاز سے ہی فکری کج روی کا شکار ہے نشأۃ ثانیہ کے بعد سے ان غلطیوں کا اعادہ مسلسل ہو رہا ہے۔ فنی مہارت نے انسانِ نَو کی صورت گری سائنس کے حقائق کے مطابق نہیں کی، بلکہ غلط مابعد الطبیعیاتی تصورات کے مطابق کی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان مبادیات کو ترک کر دیا جائے۔ ہمیں اس آہنی جنگلہ کو توڑ دینا چاہیے جو ٹھوس اشیاء کی صفات اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ہمارے مصائب کی ذمہ داری اس غلطی پر ہے جس کا صدور گلیلیو کے ایک نتیجہ خیز تصور سے ہوا ہے گلیلیو نے اشیاء کی صفاتِ اولیہ حجم اور مقدار کو قرار دیا تھا۔ جو آسانی سے ناپی اور تولی جاسکتی ہیں، اور صفاتِ ثانیہ شکل، رنگ اور بُو کو قرار دیا جو نہ ناپی جا سکتی ہیں اور نہ تولی جاسکتی ہیں اس نے ان کے درمیان تفریق اور تمیز قائم کر دی۔ مقداریت کو صفاتیت سے جدا کر دیا گیا۔ مقداریت کا اظہار ریاضیاتی زبان میں ہوا جس نے انسان کو سائنس کا تحفہ دیا۔ صفاتیت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ اشیاء سے صفاتِ اولیہ کی تجرید تو خیر درست تھی۔ لیکن صفاتِ ثانیہ کو نظر انداز کرنا ہرگز جائز نہیں تھا۔ اس غلطی کے نتائج انتہائی خطرناک نکلے۔ اب وہ اشیاء اہمیت اختیار کر گئیں جو قابلِ وزن اور پیمائش ہیں اور ان اشیاء کی اہمیت کم تر ہو گئی جو قابلِ وزن اور پیمائش نہیں ہیں۔ حالانکہ افکار و تصورات کا وجود بھی اتنا ہی بنیادی ہے جتنا کہ مادۃ الدم Serum کے اندر طبعی کیمیائی توازن کا

وجود۔ مقداریت اور صفاتیت کے درمیان تفریق اس وقت اور زیادہ گہری
ہو گئی جب ڈیکارٹ نے جسم اور رُوح کے درمیان جدائی اور دُوئی قائم کر د
اس وقت سے ذہن کے مظاہرات ناقابلِ فہم بنتے چلے گئے۔ مادی اشیاء کو
رُوحانی پہلو سے بالکلیہ جُدا قرار دے دیا گیا۔ افکار و تصورات، رنگ
راحت، حُسن و قبح کے مقابلے میں اعضاء کی ساخت نے اور عضویاتی مشین
نے اہم تر حقیقت کا مقام حاصل کر لیا۔ یہ وہ بنیادی غلطی تھی جس نے گ
بٹن دبا کر مغربی تہذیب کا رُخ اس راہ کی جانب موڑ دیا جس نے سائنس
تو بامِ عروج تک پہنچا دیا لیکن انسان کو قعرِ مذلت میں دھکیل دیا۔
"صحیح راہِ ہدایت اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ذہناً ایک
بار ہم پھر نشأۃِ ثانیہ کے افراد کی طرف متوجہ ہوں۔ ہمیں بھی اشیاء کی صفات
اولیہ اور ثانویہ میں تمیز کرنا ہو گی، لیکن ہمیں صفاتِ ثانویہ کو بھی وہی اہمیت
دینا ہو گی جو صفاتِ اولیہ کو دی جاتی ہے۔ ہم کو ڈیکارٹ کی دُوئی کو بھی ر
کرنا ہو گا۔ ذہن کو دوبارہ مادہ کے اندر داخل کرنا ہو گا۔ رُوح کو جسم س
اب ممیز نہیں سمجھا جائے گا۔ مظاہراتِ ذہن اور مظاہراتِ طبیعت دونو
پر ہمیں دسترس حاصل ہونا چاہیے۔ درحقیقت صفاتیت کا مطالعہ کر
مقداریت سے زیادہ دُشوار ہے۔ ٹھوس واقعات ذہن کو مطمئن نہیں
کرتے ہیں۔ ذہن ہمیشہ تجرید کے معروضی پہلو کو ترجیح دیتا ہے۔
"سائنس کا مطالعہ برائے خود نہیں ہونا چاہیے، نہ اس کے شُست
منہاج کے لیے، نہ اس کی چمک دمک کے لیے، نہ اس کے حُسن و جمال ک
لیے۔ سائنس کا مقصود انسان کی مادی اور رُوحانی فلاح و بہبود ہے۔
جذبات و احساسات کو بھی اتنی ہی اہمیت دینا چاہیے جتنی کہ حرارتی
حرکیات Thermo-Dynamics کو حاصل ہے۔ یہ بات ناگزیر
ہے کہ ہمارا فکری دائرہ حقیقت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے۔ اب ہم

مقداریت کی ستم رانی ——— میکانیت، طبیعیات اور کیمیا کی بالادستی کو مزید برداشت نہیں کریں گے۔ ہمیں نشاۃ ثانیہ کے دور کی پیدا کردہ ذہنی رجحان اور اس دور کی حقیقت کی من مانی تعریف کو رد کر دینا ہوگا لیکن ہم کو گلیلیو کے زمانہ سے لے کر سائنس کی تمام فتوحات کو اختیار کر لینا ہوگا۔ سائنس کی روح اور اس کا طریقہ کار ہمارا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔

بظاہر یہ بات دشوار نظر آتی ہے کہ ان اصول و مبادی کو ترک کر دیا جائے جو تین صدیوں سے مہذب دنیا کی عقل و فکر پر مستولی رہے ہیں۔ سائنس دانوں کی اکثریت ان حقیقتوں پر ایمان رکھتی ہے یعنی یہ کہ کلیات کا وجود ہے۔ ذہن اور جسم میں جدائی موجود ہے۔ ذہن کی حیثیت کمتر ہے۔ وہ آسانی سے اپنے اس ایمان کو ترک کر دینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ یہ تبدیلی دینیات، طب، صحیات، نفسیات، عمرانیات کی بنیادیں ہلا ڈالے گی۔ وہ چھوٹا سا بغیچہ جس کو ہر سائنس دان آسانی سے پرورش کرتا رہتا ہے، اب اس کو جنگل قرار دے دیا جائے گا، جس کو صاف کرنا ضروری ہو جائے گا۔

اگر سائنسی تہذیب وہ شاہراہ ترک کر دے، جس پر وہ نشاۃ ثانیہ کے زمانہ سے پیش قدمی کرتی چلی آ رہی ہے اور اس راستہ کی جانب مڑ جائے جہاں صرف واقعات کے مشاہدہ پر اکتفا کیا جاتا ہے تو پھر جلد ہی عجیب و غریب واقعات رونما ہوں گے۔ مادہ کی بالادستی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ذہنی سرگرمیوں کو بھی وہی اہمیت حاصل ہو جائے گی جو جسمانی سرگرمیوں کو حاصل ہے۔ مذہبی، اخلاقی اور جمالیاتی مظاہرات کا مطالعہ بھی اتنا ہی اہم قرار پائے گا جتنا کہ ریاضی، طبیعیات اور کیمیا کا۔ موجودہ طریقہ تعلیم و تدریس ناکارہ نظر آئے گا۔ درس گاہوں اور جامعات کو اپنا لائحہ عمل تبدیل کرنا پڑے گا۔ ماہرین صحت سے کہا جائے گا کہ وہ صرف امراض جسمانی کے دفعیہ تک ہی کیوں دلچسپی لیتے ہیں؟ ذہن اور اعصابی امراض سے دلچسپی کیوں نہیں لیتے؟

جو لوگ متعدی امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں، ان کو کیوں جدا رکھا جاتا ہے؟ جب کہ وہ لوگ جو فکری زیغ اور اخلاقی بد راہی پھیلاتے ہیں، ان کو علیحدہ نہیں رکھا جاتا۔ جو عادات امراض پھیلانے کی ذمہ دار ہیں، ان کو کیوں مضر خیال کیا جاتا ہے؟ اور جو عادات فکری اور اخلاقی امراض پھیلانے کی ذمہ دار ہیں، ان کو کیوں خطرناک خیال نہیں کیا جاتا؟ وہ عادات جن سے بدمعاشی، جرائم پسندی اور جنوں زدگی کو تقویت ملتی ہے، ان کو کیوں مضر خیال نہیں کیا جاتا؟ عوام کو چاہیے کہ وہ ایسے ڈاکٹروں سے معالجہ کرانے سے انکار کر دیں جو کل جسم و روح کے مقابلے میں صرف اس کے ایک حصے کا علم رکھتے ہوں۔ ماہرین خصوصی کو عمومی طب کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ان کو عمومی طب کے ڈاکٹروں کی رہنمائی میں کام کرنا ہوگا۔ ماہرین تشخیص امراض کو ترغیب دی جائے گی کہ وہ اعضاء اور اخلاط کے فساد کا اور نسیجوں پر ذہن کے اثرات کا مطالعہ کریں، اور اس کے برعکس حالات کا بھی مطالعہ کریں۔ ماہرین معاشیات کو اس امر کا شعور دلایا جائے گا کہ انسان غور و فکر کرتا ہے، احساس کرتا ہے، رنج و تکلیف اٹھاتا ہے؛ اور یہ کہ انسان کو محنت، خوراک اور فراغت کے علاوہ اور بھی اشیاء درکار ہیں، اور یہ کہ انسان کو طبعی اور روحانی دونوں احتیاجات لاحق ہوتی ہیں۔ اور یہ کہ معاشی اور مالیاتی بحرانوں کے اسباب اخلاقی اور فکری ہوتے ہیں۔ ہم اب بڑے شہروں کا وحشیانہ طرز زندگی اختیار کرنے پر تیار نہ ہوں، یعنی کارخانوں اور دفتروں کی ستم رانی، اخلاقی فضیلت کی معاشی قربان گاہ پر بھینٹ، ذکاوت ذہنی کی مالی مفادات پر قربانی۔ یہ وہ ثمرات ہیں جو جدید تہذیب نے ہمیں عطا کیے ہیں۔ ہمیں ایسی مشینی ایجادات کا انکار کر دینا چاہیے جن سے روحانی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔ اب معاشیات تمام انسانی سرگرمیوں کا آخری مطمح نظر نہیں قرار پائے گا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ مادیت کے مسلک سے نجات

حاصل کرنے کے بعد ہماری زندگی کے بیشتر پہلوؤں میں تبدیلی لانا ہوگی اس لیے جدید تہذیب کے پرستار ہمارے نئے تصورات کی پوری شدت سے مخالفت کریں گے۔

"بہر کیف ہمیں یہ احتیاط برتنی ہوگی کہ مادیت پرستی کی ناکامی کا ردِ عمل رُوحانیت کی شکل میں ظاہر نہ ہونے پائے۔ چونکہ مہارتِ فنی اور مادیت پرستی ناکام ہو چکے ہیں، اس لیے ان کے مخالف مسلک یعنی ذہن پرستی اختیار کرنے کی جانب رغبت بڑھ جاتی ہے۔ نفسیات کو اولیت دینا، عضویات، طبعیات اور کیمیا کو اولیت دینے سے کم خطرناک ثابت نہیں ہوگا۔ انسانی معاشرہ کو جتنا نقصان فرائڈ کے نظریات سے پہنچا ہے اتنا نقصان مشینی نقطۂ نظر سے نہیں پہنچا ہے۔ انسان کو صرف ذہن کے اندر تبدیل کرنے کا نقصان بھی اتنا ہی سنگین ہوگا، جتنا کہ اس کو مادہ میں تبدیل کرنے کا نقصان ہو چکا ہے۔ جس طرح مادۃ الدم کی صفات Properties of Blood Serum برقی ذرات کا توازن Ionic Equilibrium اور نغز مایہ کا سریان Proto Plasmic Permeability کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح خواب، شہوت Libido، روحانی حاضرات کی کیفیات Medio Mistic States دُعا کے اثرات اعضائے جسم پر، الفاظ کی یادگیری وغیرہ کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ مادہ کی جگہ پر رُوح کو رکھ دینے سے اس غلطی کا ازالہ ممکن نہیں ہے، جو نشاۃ ثانیہ کے دور میں ہو چکی ہے۔ مادہ کو نظر انداز کرنے کی غلطی اس سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگی جتنی کہ رُوح کو نظر انداز کرنے کی غلطی ہو چکی ہے۔ نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ مبادیات کو ترک کر دیا جائے، مشاہدات کو پوری طرح تسلیم کر لیا جائے اور یہ اعتراف کر لیا جائے کہ انسان بس ان حقائق سے عبارت ہے۔ نہ بیش نہ کم"[ل]

ل Man the Unknown, by Alexis Carrel p. 204—207 Bombay

مغرب میں مادی اور لادینی تہذیب کی ناکامی پر یہ بھرپور تبصرہ ہے! ایک صاحبِ خانہ واقفِ حال کا تبصرہ ہے۔ کاش مشرق کے نو دولتیے اندھے مقلد اپنی آنکھ کھولیں۔

مغربی تہذیب کا زوال اب صاف نظر آ رہا ہے۔ ہمارے دَور کا ایک حکیم لکھتا ہے۔

"ہم ظاہراً طور پر دو عہدوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ ایک ہماری شاندار ماضی کی حیاتی تہذیب اور دوسری تخلیقی مستقبل کی تصوراتی یا مثالی Ideational and Idealistic تہذیب جو آنے والی ہے۔ ہم شش صد سالہ تابناک حیاتی یوم کے اختتام پر جی رہے ہیں، سوچ رہے ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ آفتاب کی ترچھی شعاعیں جانے والے عہد کی عظمتِ رفتہ کو روشن کر رہی ہیں۔ لیکن روشنی مدہم ہے۔ اور ہر دم افزوں تاریکی کے سائے میں یہ مشکل تر ہوتا جا رہا ہے کہ چھوٹے بیٹے کے دھندلکے میں ہم صاف دیکھ سکیں اور اپنے موقف کو درست کر سکیں۔ دورِ عبوری کی اندھیری رات ہمارے سامنے اور آئندہ نسلوں کے سامنے پھیل رہی ہے۔ جس کے جلو میں خوفناک تاریکی، ڈراؤنے خواب اور دلدوز اندوہناکیاں ہیں۔ اس سے دُور پرے عظیم نئی تصوراتی یا مثالی تہذیب کی صبح انتظار کر رہی ہے۔ مستقبل کے انسان کو خوش آمدید کہنے کے لیے۔

Social and Cultural dynamics – by Pitrim Sonokin p. 625

Extending Horizon books – Boston – 1957

چھٹا باب

لادینی تحریک تعلیم گاہ میں

(۱۵۵۰ء تا ۱۹۵۰ء)

مغربی معاشرہ میں لادینی تحریک کے عروج اور غلبہ کی داستان ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ فکر و نظر، علم و عمل، معیشت و معاشرت کا کوئی مخفی سے مخفی گوشہ بھی ایسا نہیں بچا، جہاں لادینی اندازِ فکر نے غلبہ حاصل نہ کر لیا ہو۔ فرد اور معاشرہ دونوں لادینی مادی نظریات کی عملی تفسیریں بن گئے۔ ایسی صورت میں لادینی تحریک سے نظامِ تعلیم و تدریس کا متأثر ہونا لازمی امر تھا۔ تعلیم و تربیت کو ہر اعتبار سے لادینی نظریات کے مطابق ڈھال دیا گیا۔ تعلیم میں انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ فنِ تدریس میں نئے نئے تجربات کیے گئے۔ نئے نئے اصولوں کا انکشاف کیا گیا۔ بڑی کارآمد اور مفید باتیں دریافت کی گئیں، جن کے بعد فنِ تدریس نے غیر معمولی ترقی کی۔ دُنیا نے پہلی مرتبہ عمومی تعلیم کو اپنا مقصود مقرر کیا۔ مگر ہمارے پیشِ نظر تعلیم و تدریس کی عمومی ترقی کی داستان سنانا نہیں ہے، بلکہ ہم صرف ان مفکرینِ تعلیم کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جن کی وجہ سے فکر و نظر اور مقصد و غایتِ تعلیم میں تبدیلی آئی ہے، جنھوں نے نظامِ تعلیم کا رُخ ایک خاص سمت موڑ دیا۔

۱۔ تعلیم طاقت ہے

بیکن Francis Bacon — 1561 — 1626 (انگلستان) نے دعویٰ کیا کہ تعلیم فرد اور قوم کے ہاتھ میں ایک طاقت ہے۔ یہ ایک ذو معنی جملہ ہے۔ سادہ مفہوم تو اس کا یہ ہے کہ تعلیم صاحبِ تعلیم کے ہاتھ میں ایک قوت ہے جس سے وہ اپنے حالات بہتر بنا سکتا ہے۔ یہ

مفہوم درست ہے۔ اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس پس منظر میں یہ بات کہی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم فرد کی تہذیبِ نفس یا تطہیرِ افکار یا معاشرہ کی اصلاح اور فلاح و بہبود کا ذریعہ نہیں ہے جیسا کہ اہلِ کلیسا بتاتے تھے بلکہ تعلیم مادی غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ افراد کو افراد پر اور قوموں کو قوموں پر غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس معنی میں یہ مقصدِ تعلیم میں عظیم تبدیلی ہے۔ اب تعلیم اصلاحِ نفس کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ مادی قوت حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ نوآبادیاتی دور میں تو اس مفہوم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

۲۔ قدیم زبانوں کی مخالفت

مائیکل مانٹین Michel Montaigne (فرانس) نے یونانی، لاطینی زبانوں کی تعلیم کی سخت مخالفت کی جو اس دَور میں لازمی تھی۔ اس طرح اس نے ماضی سے معاشرہ کا تعلق منقطع کرنے کی کوشش کی۔

۳۔ کتابی تعلیم کی مخالفت

مائیکل مانٹین کے نزدیک تعلیم عملی تجربات کا نام ہے۔ اس وجہ سے وہ نصابِ تعلیم عملی کاموں کو قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس نے کتابی تعلیم کی سخت مخالفت کی۔

اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ انسانوں کو کتابوں کا کیڑا اور رسمی طریقہ تعلیم کا مقید نہیں ہو جانا چاہیے، تو اس کے اندر ایک صداقت موجود ہے۔ تمدنی زندگی کی وسعت پذیری کے تحت انسانی ذہن حقیقت سے زیادہ رسمیات Institutionalism کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ حقیقت کو رسمیات سے باہر لباس میں پہچاننے کی عادت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ہر اس حقیقت کا انکار کر دیتا ہے جو رسمیات کے مخصوص لباس میں جلوہ گر نہ ہو۔

انسان درحقیقت تجربہ اور ذاتی تفکر سے علم حاصل کرتا ہے۔ جب انسان نے تحریر کا فن سیکھ لیا تو اُس نے اپنے تجربے اور علم کو کتابوں میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ کتابوں نے ایک فرد کی تحصیلاتِ علم کو دُوسرے افراد تک پہنچانے میں

سہولت پیدا کر دی۔ اب خود تجربہ کرنے کے بجائے دوسروں کے علم سے استفادہ کر کے، دوسروں کی کتابیں پڑھ کر عالم بن جانا ممکن بن گیا۔ اس سہولت کے بعد علوم و فنون نے بہت زیادہ ترقی کی اور تہذیب و تمدن نے عروج حاصل کیا۔ آج کتب میں ہر قسم کا علم ذخیرہ ہو گیا ہے۔ جس کو پڑھ کر انسانوں کی غالب اکثریت عالم بن جاتی ہے۔ اب علم کو کتابوں کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ کتابوں پر حاوی اتنا ہی بڑا عالم۔ کتابوں سے باہر کسی شخص کو عالم ماننے پر موجودہ ذہن تیار نہیں ہوتا۔

اب اگر کسی شخص نے مروجہ کتابوں سے بے نیاز ہو کر اپنے طور پر تفکر اور تجربے سے علم حاصل کیا ہے۔ مروجہ رسمیات کی پابندی میں کسی درس گاہ اور کسی معمل Laboratory سے سند فراغ حاصل نہیں کی ہے، تو لوگ اس کو عالم ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ حالاں کہ ذاتی مطالعہ اور ذاتی تفکر سے بھی ایک شخص عالم بن سکتا ہے۔ اسی طرح ذاتی تجربے سے کسی فنی درس گاہ میں داخلہ لیے بغیر ایک شخص فن داں، سائنس داں، اور ماہر ٹیکنیک بن سکتا ہے۔ بلاشبہ پُرپیچ زندگی میں ہر کس و ناکس کو فن داں تسلیم کر لینا معاشرہ کے لیے خطرہ کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لیے پابندیاں درست ہیں۔ مگر یہاں ایک اہم حقیقت سے چشم پوشی کر لی جاتی ہے کہ علم ذاتی تفکر اور ذاتی تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ کتابی علم ثانوی درجہ کا ہے۔ اس لیے کتابی علم کی اس قدر بالادستی کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ خود تجرباتی علم کے لیے سرے سے کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے معاشرہ میں سب کے سب نرے مقلد ہوں اور کوئی بھی طبعزاد مفکر اور خود تجربہ کردہ علم کا حامل نہ ہو۔

۴۔ مدرسہ کارخانہ ہے

John A. Comenius, کومی نس (جرمنی) نے تعلیم میں تجربات کا عنصر شامل کیا۔ تعلیم میں بچوں کے شوق اور جذبہ کا خیال رکھنے پر زور دیا۔ اس نے مدرسہ

کو ایک ایسا کارخانہ قرار دیا جس میں نوخیز بچوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔

۵۔ کُل کے مقابلے میں جُزو کی اہمیّت

Descartes, ڈیکارٹ 1597-1650 (فرانس) نے کہا پہلے اجزاء کو جدا جدا سمجھنے کی کوشش کرو، پھر کُل سمجھ میں آجائے گا۔ مگر اس کا بالواسطہ یہ نتیجہ نکلا کہ انسان کی نگاہ اجزاء پسند ہو گئی۔ حیات انسانی کا مجموعی تصور اور کائنات کا مجموعی تصور اب توجہ کے قابل نہ رہے اور متروک ہوتے چلے گئے۔ یہ ایسا تصور ہے جس کے نتائج بڑے دُور رس نکلے اور خطرناک نکلے۔

۶۔ فطری تعلیم

Rousseau, 1712-1778 رُوسو (فرانس) نے دعویٰ کیا کہ تعلیم کا مقصد بچہ کے اندر فطری قوتوں کو پروان چڑھانا ہے۔ جس طرح ورزش سے جسمانی قوتوں کی پرورش کی جاتی ہے، اسی طرح تعلیم سے ذہنی قوتوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ اس کو "واقعی اور حقیقی تعلیم" Realistic and Positive کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اب مطمح نظر یہ قرار پایا کہ بچہ میں جو قوتیں ہیں بس ان کو ترقی دینا تعلیم کا مقصد ہے۔ نہ یہ کہ کوئی معیار خارج سے ان پر مسلط کرنا۔ روسو نے تعلیم کے معیاری Normative ہونے اور اخلاقی اور مذہبی ہونے کی سخت ترین الفاظ میں مخالفت کی۔ اس تصور سے تعلیم میں عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ تصورِ تعلیم ہی بدل گیا۔ طبعی تعلیم نے فروغ پایا اور اخلاقی اور مذہبی تعلیم کی مخالفت شروع ہو گئی۔

روسو جدید تعلیم کا امام سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کی شخصیت متنازع فیہ رہی ہے۔ ایک گروہ اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ دوسرا گروہ اس کو ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار ٹھیراتا ہے جو گزشتہ صدی میں تعلیم میں رونما ہوئی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق "یہ شخص سوفی صد یاوہ گو، جذبات کی رو میں بہنے والا، البتہ خود پرستی میں مستقل مزاج ہے۔ ایسا مصنف

ہے جس کی تحریروں میں تضاد ہے اور تسلسل کا فقدان ہے۔ جو معمہ اور پہیلی پیش کر کے قاری کے ذہن پر قابو پا لیتا ہے۔ ایسا مفکر ہے جو اپنی بات دُوسروں کی زبان سے کہلواتا ہے۔ اس کا ذاتی کردار بھی گھٹیا درجہ کا تھا۔ اس کا اندازہ اِس عمل سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے لڑکے کو یتیم خانہ میں داخل کرا دیا اور بڑے اطمینان سے لکھوا دیا کہ یہ لاوارث بچّہ ہے۔"[٭]

۷۔ تعلیم برائے پیداواری

آدم سمتھ Adam Smith, 1723-1790 (انگلستان) نے تعلیم کا مقصد ملکی پیداوار میں اضافہ کو قرار دیا۔ اب یہ بات واضح ہوگئی کہ جدید مفکرین کے نزدیک انسان مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہ دُنیا انسان کے لیے نہیں ہے بلکہ انسان دُنیا کے لیے ہے۔ تعلیم کا مقصد تعمیرِ سیرت نہیں ہے بلکہ پیداوار بڑھانا ہے۔ اس کے بعد سے تعلیم کو معاشی اقدار کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔

۸۔ تعلیم برائے ریاست

فکٹے Fichte, 1762-1814 (جرمنی) کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ شہریوں کو تعلیم کے ذریعہ ایسے طریقے پر ڈھال دیا جائے کہ وہ ریاست کی بلا چون وچرا اطاعت کریں۔ اس کے نظریات سے جرمنی میں فسطائی تحریک نازی ازم کو تقویت حاصل ہوئی۔

۹۔ دینی اور اخلاقی تعلیم کی ناقدری

فیدرخ ھربارٹ Fredric Herbart, 1776-1834 (جرمنی) نے دعویٰ کیا کہ علم صرف دو ہیں۔ علم فطرت یعنی سائنس اور علمِ انسان یعنی معاشرتی علوم۔ ان کے علاوہ دُوسرے علوم یعنی لسانی، اخلاقی اور مذہبی علوم کو وہ فروتر درجہ دیتا ہے۔ اس کے نظریات کی اشاعت کے بعد سے

٭ A Short History of Educational Ideas — by S. T. Curtis — P. 262 London — 1963.

مادّی علوم کو حاصل کرنا آداب، اخلاق، مذہب اور تربیت سب کا بدل قرار دے دیا گیا۔ اس نے تعلیم سے مذہبی اور اخلاقی اجزاء خارج کر کے تعلیم کو لادینی بنا دیا۔

۱۰۔ تعلیم برائے خواص

تھامس آرنلڈ Thomas Arnold. (انگلستان) نے رگبی Rugby انگلستان میں اُمراء کے بچوں کے لیے جداگانہ پبلک اسکول قائم کیا۔ اب تک درس گاہوں کی اہم قدر انسانی مساوات تھی۔ امیر اور غریب سب کے بچے یک جا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اب طبقاتی تفریق سامنے رکھ کر درس گاہوں کو قائم کیا گیا۔ اُمراء کے بچوں کے لیے اعلیٰ مدارس اور عوام کے بچوں کے لیے ادنیٰ مدارس قائم کیے گئے۔ پبلک اسکول اسی طبقاتی ذہنیت کی تسکین کے لیے کھولے جاتے ہیں اگرچہ ؏ برعکس نام نہند زنگی کافور۔ کے مصداق ان کا نام پبلک اسکول یعنی عوامی اسکول رکھا جاتا ہے۔

۱۱۔ محسوسات کی تعلیم

آگسٹ کومٹ Auguste Comte, 1798-1857 (فرانس) نے امور مابعد الطبیعیات کی سخت مخالفت کی اور تعلیمی مضامین کو صرف عالم محسوسات تک محدود کرنے پر زور دیا۔ عالم محسوسات میں مقیّد ہو جانے کے بعد مادّی اغراض اور نمود و نمائش سے بڑھ کر اور کوئی مقصد پیشِ نظر نہیں رہتا۔

۱۲۔ تعلیم برائے ملازمت

میکالے Macauley, 1800-1859 (انگلستان) نے ہندوستان میں جو نظامِ تعلیم رائج کیا۔ اس کا مقصد حکومت کو کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے کلرک فراہم کرنا تھا۔ دُنیا میں شاید ہی کسی نے نظامِ تعلیم کا مقصد اتنا پست مقرر کیا ہو۔

۱۳۔ نسوانی تعلیم میں مساوات

رسکن Ruskin, 1819-1900 (انگلستان) نے اس نظریہ کی اشاعت

کی کہ لڑکیوں کو بھی وُہی تعلیم دینا چاہیے جو لڑکوں کو دی جاتی ہے۔ دونوں صنفوں کے درمیان جسمانی، ذہنی اور معاشرتی فرق کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا۔

۱۴۔ معاشرتی علوم کی تحقیر

ہربرٹ اسپنسر، Herber Spencer، 1820-1903 (انگلستان) نے سائنسی علوم کی اشاعت کی زبردست کوشش کی اور معاشرتی علوم کی سخت مخالفت کی۔ اس کے بعد سے درس گاہوں میں سائنس کے مضامین کو آرٹس کے مضامین کے مقابلے میں برتر حیثیت حاصل ہو گئی۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ انسان معاشرہ کا جُزو بن کر زندگی گزارتا ہے۔ اِس لیے معاشرتی علوم کی اہمیت درحقیقت علمِ نباتات اور علمِ کیمیا کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہے۔

۱۵۔ تعلیم کا مقصد خارجی نہیں

جان ڈیوی، John Dewy، 1859-1952 (امریکہ) کے نزدیک تعلیم کسی خارجی مقصد کے لیے نہیں دی جاتی ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم کا مقصد خُود عملِ تعلیم ہے۔ عملِ تعلیم خُود بخود اپنے مقاصد تشکیل دیتا رہتا ہے۔ تعلیم کے مفکّرین کے برخلاف ڈیوی کی لَے بالکل نرالی ہے۔

۱۶۔ تدریسی تعلیم ماضی کا بوجھ

وہائٹ ہیڈ، White Head، 1861-1947 (انگلستان) کے نزدیک تعلیم کے معنی علم کا اِستعمال سکھانا ہے۔ تعلیم کا تعلق فکر سے کم اور عمل سے زیادہ ہے۔ اس کے نزدیک عملی تعلیم کی اہمیت ہے۔ تدریسی تعلیم کو وہ "مُردہ الفاظ" اور "ماضی کا بوجھ" قرار دیتا ہے۔ اخلاق، مذہب اور علومِ قدیمہ کی اس کے یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

۱۷۔ ذہنی تربیت کے لیے سائنسی تعلیم

سابق میں تربیت کا مفہوم مذہبی اور اخلاقی تھا۔ اس کے لیے آرٹس کی تعلیم یا لبرل ایجوکیشن کو ضروری خیال کیا جاتا

تھا۔ وہائٹ ہیڈ نے دعویٰ کیا کہ سائنسی اور فنی تعلیم سے بھی اسی قدر ذہنی تربیت ہو جاتی ہے، جس قدر فنون کی تعلیم سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سے ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے سائنس اور آرٹس کے تمام مضامین یکساں قرار پاگئے۔ نفسیات ہو، تاریخ ہو یا کیمیا، سب برابر ہیں۔ تربیت کے لیے اخلاقی اور مذہبی تعلیم کی ضرورت کو تسلیم کرنے سے اِنکار کر دیا گیا۔

۱۸۔ تعلیم زندگی گزارنا ہے

کلپیٹرک Kilpatric, 1871- (امریکہ) کے نزدیک تعلیم کا مقصد درس و تدریس نہیں ہے، بلکہ زندگی گزارنا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص بھی اس دُنیا میں پیدا ہُوا ہے۔ وُہ خواہی نخواہی زندگی تو گزارتا ہی ہے۔ یہ کیا مقصد ہُوا؟ اب اگر یہ کہا جائے کہ بہتر زندگی گزارنا مقصد ہے تو پھر بات اخلاق کے دائرہ میں چلی جاتی ہے۔ اس کے لیے صاف کہنا چاہیے کہ اچھی زندگی گزارنا زندگی کا مقصد ہے۔

۱۹۔ تعلیم برائے مسرّت

نیل Alexander Neil, 1883 (امریکہ) نے دعویٰ کیا ہے کہ تعلیم کا مقصد حصولِ مسرّت ہے۔ کھیل کا مقصد بھی حصُولِ مسرّت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کھیل بھی تعلیم ہے اور ہر کھلنڈرا لڑکا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

۲۰۔ تعلیم برائے اقدار

جارج کاؤنٹ George Count, 1889- (امریکہ) کے نزدیک تعلیم ایسا معاشرتی وسیلہ ہے جس سے عالم گیر اقدارِ انسانی اور عالم گیر شہرت کے تصورات نوخیز نسلوں کو سکھائے جا سکتے ہیں۔

۲۱۔ تعلیم برائے تربیتِ افراد

ہچن Robert Hutchins, 1894- (امریکہ) نے تعلیم میں ترقی پسندی اور اصلاح پسندی کی اصطلاحوں کی مخالفت کی ہے۔ اس کے خیال میں تعلیم، اصلاح

معاشرہ نہیں؛ بلکہ اصلاحِ فرد کا ذریعہ ہے۔ تعلیم ایک فرد کی ذہنی اور فکری تربیت کرتی ہے۔

۲۲۔ تدریسی تعلیم کی اہمیت

بیگلے Prof. Bagley, 1934- امریکہ نے ڈیوی کے فلسفہ نتائجیت Pragmatism کی سخت مخالفت کی تعلیم بذریعہ عمل کی بجائے تدریسی تعلیم کی اہمیت کو نمایاں کیا۔

۲۳۔ تعلیمی منصوبہ بندی

کارل مین ہیم Karl Mannheim,1934- انگلستان نے نازی جرمنی کے فلسفہ سے متاثر ہو کر تعلیم میں منصوبہ بندی پر انتہائی زور دیا۔ اس کی کوشش سے متاثر ہو کر برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۹۴۴ء میں تعلیمی تنظیمی ایکٹ پاس کیا۔

ساتواں باب

مغربی نظامِ تعلیم کی اقدار

مغربی نظامِ تعلیم بہت سے شعبوں پر مشتمل ہے۔ بعض شعبوں میں مفید اور کارآمد طریقے رائج کیے گئے ہیں۔ خصوصاً پسٹالوزی Pestalozzi, 1746-1827 فروبل Froebal,1782-1852 اور مانٹے سوری Montessori, 1870-1952 کے تجربات۔ یہ سب کوششیں قابلِ قدر ہیں اور مستحسن ہیں۔ درس و تدریس کے طریقوں سے صرفِ نظر کرکے ہمارے پیشِ نظر فی الوقت صرف مقاصدِ تعلیم پر گفتگو کرنا ہے۔ ان اقدارِ تعلیم پر گفتگو کرنا ہے جو مغربی نظامِ تعلیم میں بمنزلہ خون رواں دواں ہیں۔ ان اقدار کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ ان کی واقعی قدر و قیمت متعین کرنا ہے۔ اور اس بات کا اندازہ لگانا ہے کہ ان کے اجرا سے مغربی معاشرہ کو کتنا فائدہ پہنچا اور کس قدر نقصان۔ ذیل میں مغربی نظامِ تعلیم کی بعض اقدار کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ لادینیت

مغربی معاشرہ انکارِ مذہب اور انکارِ مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر استوار ہوا ہے۔ اس لیے مذہب دشمنی اور لادینیت اس نظامِ حیات کی معروف اور مقبول قدر رہے۔ اس نظامِ حیات کے رگ و ریشہ میں لادینیت سرایت کیے ہوئے ہے۔ لادینیت کو اس نظام میں اصولِ موضوعہ کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ابتدا میں ہی لادینی تصورِ حیات کو نوخیز طلبہ کے ذہنوں میں راسخ کرنے کی پیہم کوشش کی جاتی ہے۔ سرکاری سطح پر

احکام نافذ کیے جاتے ہیں، جن کے ذریعہ سرکاری درس گاہوں میں ہر قسم کے مذہب کی تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی۔ امریکہ کی ریاست میساچوسیٹ Massachusetts نے پہل کی اور ۱۸۲۹ء میں تعلیمی ایکٹ نافذ کیا جس کی رُو سے سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح انگلستان نے ۱۸۷۵ء سے تعلیمی ایکٹ کے ذریعہ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ دوسرے مغربی ملکوں نے کم و بیش انھی خطوط پر اپنے یہاں احکام نافذ کیے اور اپنے شہریوں کو مذہب کی تعلیم حاصل کرنے سے روک دیا۔

مذہب کی حقیقت

اس معاندانہ رویّہ کا سبب یہ ہے کہ اہلِ مغرب مذہب کی حقیقی تعلیم سے کبھی واقف نہ ہوئے۔ ان کو مسیحی مذہب سے سابقہ پیش آیا تھا، جس کو آغاز ہی میں سینٹ پال نے مسخ کر ڈالا تھا۔ اس نے یہود دشمنی میں دینِ مسیحی سے یہودی عناصر خارج کر کے اس کا مُثلہ کر ڈالا تھا۔ اس کو مسخ کر ڈالا تھا۔ تحریف اور تغیّر کی کس قدر آزادی سینٹ پال S.T. Paul نے حاصل کر لی تھی، اس کا اندازہ اس کے اس قول سے ہو جاتا ہے:

"اگر میرے جھوٹ کے کہنے کے سبب سے خدا کی سچائی
اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی، تو پھر کیوں گنہگار
کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے، اور ہم کیوں بُرائی نہ کریں کہ
بھلائی پیدا ہو۔" (انجیل۔ رومیوں ۳ : ۷)

اس آزادی کے ساتھ اس نے مذہب کی جامعیت کا خاتمہ کر دیا۔ دین و دنیا کی تفریق قائم کر دی۔ کفارہ کا عقیدہ وضع کیا جس نے نجات کے لیے اعمالِ حسنہ کی ضرورت بھی ختم کر دی۔ پھر نئی نئی بدعتیں پیدا

ہونے لگیں۔ رہبانیت کی تحریک کے زیرِ اثر ترکِ دنیا میں اس قدر غلو سے کام لیا گیا کہ افراد کی طبعی زندگی اور بقائے معاشرہ سے چشم پوشی کر لی گئی۔ پوپ، بندوں اور خدا کے درمیان ایک واسطہ بن کر بیٹھ گیا۔ اب پوپ کی اجازت کے بغیر کسی کو نجات نہیں مل سکتی۔ اس طرح تمام انسانوں کی قسمت ایک فرد کے ہاتھ میں آگئی۔ ایک گوشت پوست کا انسان تمام لوگوں کا مالک بن گیا۔ وہ مطلق العنان تھا اور سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ فرقوں کی باہمی آویزش اور قتل و غارت گری اس پر مستزاد تھی۔ کلیسا نے علم کی نئی رو یعنی سائنس کی مخالفت کر کے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ان سب عوامل نے مل کر اہلِ مغرب کے ذہن کو مذہب دشمنی کی راہ پر ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ ہر قسم کے مذہب کے مخالف بن گئے۔

اگر مذہبی جذبات کی رَو میں بہہ جانے والے پادری غلط تھے، تو دوسری جانب جدیدیت کی ترنگ میں آ کر سائنس دان بھی غلط تھے، جنھوں نے تمام مذاہب کو مروجہ مسیحیت پر قیاس کر لیا۔ خالی الذہن ہو کر کبھی کسی نے مذہب کا مطالعہ نہیں کیا۔

مذہب ایک ضرورت

مذہب انسان کی اہم ضرورت ہے۔ مذہب فرد کی زندگی کو معنویت بخشتا ہے۔ اس کی زندگی کا رُخ متعین کرتا ہے۔ مذہب کی تعبیر قبول کر لینے کے بعد زندگی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مذہب انسان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کے بعد بھرپور زندگی گزارنے پر انسان آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی خاطر مرنے اور جینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مذہب کائنات کو مفہوم اور معنی عطا کرتا ہے۔ اس کے بعد مصائب اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مذہب

افراد کی زندگیوں کو جذبہ، لگن اور سپردگی سے بھر دیتا ہے۔ مذہب کے انکار سے انسانی زندگی میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے، جس کو نہ فلسفہ نہ سائنس، نہ ادب اور آرٹ، نہ تفریح و سیاحی کوئی شے پُر نہیں کر سکتی۔ مذہب کا کوئی بدل موجود نہیں ہے۔

مذہب سے محرومی نے مغربی معاشرہ کے انسان کی رُوح میں ناآسودگی بھر دی ہے۔ وہ دائمی طور پر ایک اضطراب اور اختلال میں مبتلا رہتا ہے۔ اس نے مادر پدر آزاد حیوانی اور بہیمی زندگی بسر کر کے دیکھ لیا۔ مگر مضطرب روح کی آسودگی کا سامان نہ یہاں ہے نہ وہاں، مادی لذتوں اور آسائشوں میں غرق ہونے کے باوجود مغربی انسان پریشان ہے، سرگرداں ہے، وحشتِ دل سے دوچار ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ سکونِ قلب اور طمانیتِ رُوح کا واحد ذریعہ خدا پر ایمان ہے، جو اس کی زندگی سے خارج ہو چکا ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

"آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔"

مذہب کے بغیر معاشرہ میں باہمی توازن برہم رہتا ہے۔ اخلاقی قدریں پامال رہتی ہیں۔ عدل و انصاف کے من مانے تصورات رائج ہو جاتے ہیں۔ ظلم و ستم کو قانون کا نام دیا جاتا ہے۔ جمہوریت کے پردے میں ایک پارٹی اور ایک فرد کی حکمرانی کا تخت بچھ جاتا ہے ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
اور تو سمجھا اسے آزادی کی ہے نیلم پری

مظلوم و مقہور انسانوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ مذہب معاشرہ میں عدل و انصاف کا ضامن ہوتا ہے۔ انسان سے بالاتر ہستی کا قانون معاشرہ میں رائج ہوتا ہے۔ وہ سب کے لیے محترم و مقدس ہوتا ہے۔ ظالم و مظلوم، حاکم و محکوم، اقلیت و اکثریت

سب پر اس کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔ مظلوم ظالم کے خلاف، محکوم حاکم کے خلاف، اقلیت اکثریت کے خلاف دادرسی اور دادخواہی کر سکتی ہے۔ وہ خدا اور آخرت کے نام پر اپیل کر سکتا ہے۔

موجودہ دور کے وضعی قوانین صرف محکوم کے واسطے بنائے جاتے ہیں۔ حاکم ان سے عملاً بالاتر رہتا ہے۔ حاکم کا طرزِ عمل کسی قاعدہ قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ مذہب کے خاتمہ کے بعد اب وہ مشترک بنیاد معدوم ہو گئی جس سے دادرسی کی جاتی۔ اب مظلوم کے پاس چارہ جوئی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مذہب کے خاتمہ کے بعد سے چند افراد کی مطلق العنانی میں اضافہ ہو گیا اور سارے معاشرہ کے مظالم میں بھی اضافہ ہو گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے انسانی نفسیات کی ایک احتیاج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

"فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا، سائنس ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا، لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا۔ اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں کی ہی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہی باتوں پر قناعت نہیں کر سکتے، جنھیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لیے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں، جنھیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن ماننا پڑتا ہے۔"[1]

---

[1] فلسفہ از ابوالکلام آزاد ص ۲۳

مذہب انسان کی نفسیاتی ضرورت ہے۔ ذہنی اور نفسیاتی صحت کے لیے اس کی شدید ضرورت ہے، جس کا اعتراف مغرب کے لادینی سائنس دان بھی کرنے لگے ہیں۔ بین الاقوامی کلیسائی مشاورتی کانگریس منعقدہ ایمسٹرڈم Amsterdam اور معالجین نفسیات اور ماہرین عمرانیات کی بین الاقوامی کانگریس منعقدہ لندن، دونوں اپنے اپنے طریقہ سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ موجودہ نسلِ انسانی کو روحانی احیاء اور اخلاقی برتری کی شدید ضرورت ہے ورنہ بیر عمومی پیمانہ پر طبعی اور ذہنی تخریب کاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میکس روزنبرگ لکھتا ہے:

"طبعی تندرستی اور ذہنی صحت، اخلاقی اور مذہبی صحت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ انسان کا جب یہ ایمان ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ ایک قوت ہے، جس کو روح کہیں یا تخلیقی ذہن، جو قوت اعلیٰ اور کائناتی تخلیقی ذہن سے فیض حاصل کرتی ہے، جب وہ یہ تسلیم کرے کہ یہ برتر روحانی اور اخلاقی قوت ہمارے اندر موجود ہے اور اس بات کا شعور رکھے کہ خیر و فلاح کا نظام قائم کرنا ہمارا اخلاقی فریضہ اور ذاتی ذمہ داری ہے، تب ہم اپنی حیوانی جبلتوں کو قابو میں لا سکتے ہیں۔ اور نفسی الجھنوں پر غلبہ پا سکتے ہیں، جو بہت سے ذہنی امراض کا سبب بنتی رہتی ہیں۔"[1]

صدیوں کی علمی جد و جہد اور تحقیق و انکشاف کے نتیجے میں اہلِ مغرب کے پاس مختلف امور سے متعلق معلومات کا وافر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ لیکن

---

[1] Encyclopaedia of Medical Help by Max Rosenberg, page 888 New York. 1967

معلومات کا یہ سارا انبار بے جوڑ ہے۔ اَن میل ہے اور غیر مربوط ہے۔ اور کسی بالاتر سلسلہ سے منسلک نہیں ہے۔ کائنات سے متعلق مختلف معلومات کو ایک سلسلہ میں پرونے کے لیے اہلِ مغرب کے پاس کوئی رشتۂ جامعہ نہیں ہے۔ دانے تو بہت جمع ہو گئے ہیں، مگر اُن کو پرو کر تسبیح بنانے والا دھاگہ موجود نہیں ہے۔ مغرب کے مجموعۂ افکار میں کوئی مرکزی نقطہ نہیں ہے۔ مغربی نظام کے عالم فاضل کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ زندگی کی غایت کیا ہے؟ انسان کی اس ساری جدّ و جہد، دوڑ دھوپ کا مقصود کیا ہے؟ مغربی تعلیم سے کوئی جامع تصور طالب علم کے ذہن میں نہیں اُبھرتی، مغربی نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا عیب اور نقص مقاصدِ عالیہ اور غایاتِ حیات کا فقدان ہے۔

مدرسہ[1] عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کلیسا کے پاس ایک فلسفۂ حیات موجود تھا۔ انسان کے مستقبل کے لیے اس کے پاس ایک پُر اُمید مقصود موجود تھا۔ اس کے حصول کے لیے ایک لائحہ عمل موجود تھا۔ جب تک تعلیم کلیسا کے ہاتھ میں رہی، اس وقت تک نہ موجودہ بے یقینی کی کیفیت طاری تھی اور نہ یہ ذہنی انتشار اور خلفشار برپا تھا۔ لیکن جب تعلیم ریاست کے ہاتھ میں چلی گئی، اس وقت سے صورتِ حال بالکل بگڑ گئی۔ ریاست کے پاس کوئی فلسفۂ حیات نہیں، نہ ایمان راسخ ہے نہ یقین محکم ہے۔ وہ اس بات سے بے نیاز ہے، بلکہ بے خبر ہے کہ اس کے زیرِ اہتمام درس گاہوں میں کس قسم کے

---

[1] "مدرسہ" سے مغربی تعلیم مراد ہے۔

انسان ڈھل کر نکل رہے ہیں۔ درس گاہوں سے فارغ شدہ طلبہ کو خود بھی یہ بات معلوم نہیں کہ مستقبل میں ان کا کیا لائحہ عمل ہوگا۔ ان کو کس مقصد کے لیے تیار کیا جا رہا ہے؟ بے مقصدیت اور لاابالی پن اس نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا نقص ہے۔

لادینی تعلیم کے یہ نقائص اور عیوب آج ہر چشمِ بینا پر عیاں ہیں۔ ہر مفکر ان کی نشان دہی کرتا ہے۔ لی کومٹ لکھتا ہے:

"بچہ کو فکری غذا دے دینا، تھوڑی سی معلومات حوالے کر دینا اور اس سے قبل کوئی مضبوط اخلاقی بنیاد فراہم نہ کرنا، جو فکری طوفان کو برداشت کر سکے — یہ ساری کاوش ریت پر محل تعمیر کرنے کے مترادف ہے۔ عمارت جتنی زیادہ اونچی ہوگی، گرنے کا اندیشہ اتنا ہی زیادہ قوی ہوگا۔"[1]

جولین ہکسلے (۱۸۸۷ء تا ۱۹۷۵ء) میں لکھتا ہے:

"مذہب کی رہنمائی سے اور قدیم رجحانات سے قطع تعلق کر لینے کے بعد جدید تعلیم گمراہ ہو گئی ہے۔"

برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ء تا ۱۹۷۰ء) جیسے کٹر دہریہ کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا ہے:

"اگر سائنسی تہذیب کو برتر تہذیب بننا ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ معلومات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ حکمت میں بھی اضافہ ہو۔ حکمت سے میری مراد زندگی کی غایات کا صحیح تصور ہے۔ مگر یہ وہ شے ہے جس کو سائنس مہیا نہیں کر سکتی۔"[2]

Human Destiny, by Le Comte, page 146

Scientific Thought, by Russel, page 12

ہندوستان کی حکومت نے یونیورسٹی تعلیم کی اصلاح کے لیے ۱۹۴۸ء میں ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ کمیشن کی رپورٹ کے دو اقتباسات سننے کے قابل ہیں:

"مشرق و مغرب کے مفکرین کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ کائنات کی ایک مربوط تصویر پیش کی جائے اور نظامِ حیات مرتب انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ . . . . انسان ان میل، بے جوڑ معلومات کے انبار کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کو اس بات کی خواہش رہتی ہے کہ وہ اشیاء کے مابین روابط کا ادراک کرے۔ مختلف مظاہرات فطرت کا مطالعہ کریں۔ لیکن انسان کی زندگی کا مجموعی تصور بھی ہم کو حاصل ہونا چاہیے۔ یہ معلومات غیر مربوط اجزاء کا ڈھیر نہ ہوں، بلکہ باہم مرتب و مربوط اور منسلک ہوں۔"

رادھا کرشنن — ہندوستان کا فلسفی صدرِ مملکت کہتا ہے:

"یقین جانیے دنیا کی بنیادی ضرورت بہت وسیع و عمیق ہے۔ معاشی، معاشرتی یا سیاسی ردوبدل سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ آج روحانی بیداری اور احیاءِ ایمان کی شدید ضرورت ہے۔"

دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں یورپ کے لادینی معاشرہ نے زبردست تباہی اور غارت گری مچا دی تھی۔ اس بھیانک غارت گری کو دیکھ کر حکماء اور فضلائے یورپ لادینی معاشرہ کے خلاف چیخ اٹھے تھے۔ مغربی دنیا کے اہم ترین روزنامے "لندن ٹائمز" نے فروری ۱۹۴۵ء کو اہم اداریہ سپردِ قلم کیا تھا۔ واضح رہے کہ ان ایام میں لندن جرمنوں کی مسلسل بمباری کا ہدف بنا ہوا تھا۔ انگلستان کا یہ

اخبار لکھتا ہے :۔

"ایک ملک جو عقیدۃً عیسائی ہے، ایک ملک جس نے آج کل اپنا سب کچھ مسیحیت کے اصولوں کی حفاظت پر لگا دیا ہے، اس ملک میں قومی نظام تعلیم ایسا رائج ہے، جو مستقبل کے شہریوں کو خالص کافرانہ (HEATHEN) تربیت دیتا ہے۔"

مزید وہ لکھتا ہے :۔

"تعلیم کہلانے کا استحقاق حاصل کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کی بنیاد مذہب پر رکھی جائے۔ اس لیے کہ مذہب کے بغیر سرے سے کوئی تعلیم، تعلیم ہی نہیں ہوتی۔ بہترین شہریت کا انحصار بہترین سیرت و کردار پر ہے، اور انسان کی سیرت اس کے عقائد کی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے۔"

اس کے بعد وہ ایک سوال اٹھاتا ہے :۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ریاست ان سادہ حقیقتوں کو نظر انداز کر دے اور مذہبی تعلیم سے کوئی سروکار نہ رکھے۔"

آخر میں وہ مشورہ دیتا ہے :۔

"اس تعلیم (مذہبی) کا شہریوں کی تربیت میں سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہونا چاہیئے۔"

مشہور ماہرِ تعلیم جیمس روس (James Ross) اِسی اداریہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"مذہب کا مرتبہ لائحہ عمل (Time Table) میں شامل کسی مضمون سے بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ بلاشبہ اس کی تدریس کے لیے لائحہ عمل میں بھی ضرور وقت متعین

ہو جانا چاہیئے، لیکن اس کو فی الحقیقت زندگی کے تمام اعمال میں جاری اور ساری روح رواں بن جانا چاہیئے۔"

وہ مزید لکھتا ہے :۔

"آج اکثر ہوش مند افراد کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ تعلیم سے اگر اعلیٰ تہذیب پیدا کرنا مقصود ہے یا خود تہذیب کو برقرار رکھنا مقصود ہے، اس کو وقتاً فوقتاً بربریت کی نذر ہونے سے بچانا مقصود ہے ———— تو لازماً اس کو پھر مذہب پر مبنی ہونا چاہیئے۔" [۱]

ع جب دیا رنج بتوں نے تو خُدا یاد آیا

سخت طوفان سے دوچار ہو جانے کے بعد افراد بھی اور اقوام بھی اصل حقیقت کا ادراک کر لیتی ہیں۔ ان پہ اپنی غلط روی اور غلط کاری واضح ہو جاتی ہے۔ کلمۂ حق ان کی زبان سے ادا ہونے لگتا ہے۔ لیکن حادثہ گزر جانے کے بعد پھر سابقہ غفلت کے پردے عقلوں پر پڑ جاتے ہیں۔ پھر ہر شخص حال مست ہو جاتا ہے۔ تلخ حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ گزشتہ حادثہ کو جلد از جلد فراموش کرنے کی سعی نامشکور میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ اہلِ مغرب کا حال جنگ گزر جانے کے بعد ہوا۔ تاہم یہ حادثہ اس لحاظ سے ایک مفید خدمت انجام دے گیا کہ اس نے عقلائے مغرب کی آنکھیں کھول دیں۔ خواہ وقتی طور پر ہی سہی۔ ماہرینِ تعلیم نے لادینی تعلیم کے بھیانک نتائج کا بچشمِ سر مشاہدہ کر لیا۔ اور اس امر کا اعتراف کھلے دل کے ساتھ کر لیا کہ معاشرہ کے لیے حقیقی تعلیم، دینی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

---

[۱] Ground work of Educational Theory. by James Ross, page 24

۲۔ غیر جانبداریت

مغربی مفکرین غیر جانب داریت کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ ہر شخص کو آزادی حاصل ہونا چاہیے کہ اُمور مابعد الطبعیات کے متعلق، کائنات، زندگی اور آخرت کے متعلق خود اپنا نقطۂ نظر وضع کرے۔ اس کو آزادی ہو کہ زندگی کی غایت اور کائنات کی حقیقت کے متعلق جو چاہے عقیدہ اختیار کرے۔ اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ اس لیے اس کو کسی مخصوص مذہب اور اخلاق کی تعلیم نہیں دینی چاہیے۔ اپنا مذہب اور اخلاق وہ خود وضع کرے۔ اہلِ مغرب کے نزدیک یہ مکمل غیر جانب داریت ہے اس طرزِ عمل کو وہ حد درجہ قابلِ تعریف خیال کرتے ہیں۔

یہاں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی شخص صحیح معنوں میں غیر جانب دار ہوتا ہے؟ کیا اس آسمان کے نیچے کوئی ایسا مقام موجود ہے جہاں مذکورہ بالا فلسفہ غیر جانب داریت کے مطابق بچوں کی پرورش اور نگہداشت کی جاتی ہو؟ کیا کوئی شخص گھر، ماحول اور معاشرہ سے کٹ کر پروان چڑھتا ہے؟ ماں کی گود میں پروان چڑھ کر، درس گاہوں میں اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے، معاشرہ میں کار فرما ذرائع ابلاغ عامہ کے درمیان پل بڑھ کر، کوئی شخص یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ وہ غیر جانب دار ہے؟ اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے غیر شعوری طور پر وہ ایک رجحان کا حامل بن جاتا ہے۔ مغربی درس گاہوں کا طالبِ علم مذہب بیزاری، ورنہ کم از کم مذہب سے لاتعلقی کا سبق لاشعوری طور پر درس گاہوں کے در و دیوار سے، کتابوں سے، اساتذہ سے سیکھ لیتا ہے۔ اس لیے کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ مغربی درس گاہوں کا طالبِ علم زندگی کی غایت اور کائنات کی حقیقت کے معاملے میں غیر جانبدار ہوتا ہے۔ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مغربی ماحول میں رہ کر طالبِ علم کا ذہنی سانچہ لادینیت اور منفی اندازِ فکر پر خود بخود مستحکم ہو جاتا ہے۔

غایتِ زندگی کی تعلیم

حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف تو معمولی معمولی پیشوں اور ہنروں کی تعلیم باقاعدہ طور پر طلبہ کو دی جاتی ہے، دوسری طرف غایتِ حیاتِ انسانی کی تعلیم طلبہ کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دے دی گئی ہے۔ کیا یہ وہی تنگ دلی اور کوتاہ نظری نہیں ہے جس کا طعنہ سائنس دان اہلِ کلیسا کو دیتے رہے ہیں۔ غایت تخلیق آدم اور مقصودِ حیاتِ انسانی وہ اُمور ہیں جن پر گزشتہ ہزاروں سال سے نوعِ انسانی کے بہترین دماغ، حکماء، فلاسفہ اور مفکرین غور، ماری کرتے چلے آ رہے ہیں۔ طالیس (Thales) ۶۲۴ تا ۵۴۸ ق۔م، اور سقراط (Socretes) ۴۷۰ تا ۳۹۹ ق۔م کے وقت سے لے کر ژین پال سارتر (Jean Paul Sartre, 1905-1980) تک ہر فلسفی نئی بات سُناتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس پر یہ فاضل لوگ متفق ہوں۔ پھر انھی اُمور کی تعبیر اور تشریح مذاہب کے بانی بزرگ ہستیاں کرتی ہیں، جو ان کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے، لیکن جس کے ماننے والے ہر دَور میں لاکھوں اور کروڑوں انسان رہے ہیں۔ ایسی دشوار گزار سنگلاخ زمین کے سفر پر ہر نوخیز بلندی کو بلا ہادی و رہنما اور بلا زاد و راحلہ روانہ کر دینا چاہتے ہیں، اور یہ توقع قائم کرتے ہیں کہ جہاں دوسرے تمام فلسفی نہ پہنچ سکے وہاں یہ نوخیز بلندی پہنچ جائے گا۔ جو مقصود وہ حاصل نہ کر سکے وہ یہ حاصل کر لے، کائنات اور حیاتِ انسانی کے متعلق صحیح ادراک کر لے، اپنی منزلِ مقصود خود دریافت کر لے، اپنا مذہب اور اپنے لیے دستورِ حیات خود وضع کرے۔ کتنا عظیم بار ہے، کتنے ناتواں کاندھوں پر؟ یہ حسنِ ظن اور خوش گمانی

کی ایک نادر مثال تو قرار دی جا سکتی ہے لیکن واقعیت اور حقیقت پسندی سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بلا سوچے سمجھے اور غور و خوض کیے بغیر فوری تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہر شخص صحیح یا غلط ایک راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اور پھر عمر بھر اس راہ پر چلتا رہتا ہے۔ کسی حادثہ سے دوچار ہو کر کبھی غلطی پر متنبہ حاصل بھی ہو جاتا ہے تو بسا اوقات نئی راہ اختیار کرنے اور صعوبتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا۔ ناچار پھر اسی راہ پر آنکھیں بند کر کے گامزن رہتا ہے، یہاں تک کہ مہلتِ حیات ختم ہو جاتی ہے اور وہ پیوندِ خاک ہو جاتا ہے۔

جب علم معاشیات میں فن کے بہترین مفکرین کی آراء سے طالب علموں کو باخبر کیا جاتا ہے۔ جب علم سیاسیات میں تمام مروجہ سیاسی نظریات اور ان پر تنقید تبصرہ طالب علموں کو سکھائے جاتے ہیں، تو پھر حقیقت کائنات اور مقصدِ تخلیقِ آدم ہی کیوں ایسا موضوع ہے جہاں نوخیز کو بھٹکنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں کیوں اہل تر، فاضل تر دانائے راہ بزرگوں کے مشاہدات طالب علموں کو نہیں بتائے جاتے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مغربی مفکرین کے تحت الشعور میں پنہاں مذہب بیزاری کا جذبہ صحیح طرزِ عمل اختیار کرنے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے؟

نظریاتی تعلیم اور اخلاقی تعلیم کے خلاف بعض لوگ یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ اس طرح تعلیم میں جبر کا عنصر شامل ہو جاتا ہے اور آزادانہ تخلیق کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، واضح رہے کہ جس سطح پر مذہب گفتگو کرتا ہے وہ ماورائے عالم مادیات ہے، اس لیے وہاں پرواز کرنے سے عقل کے پر جلتے ہیں۔ وہاں آزادانہ تحقیق کے نام پر جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ سب محض ظن و تخمین ہے۔ وہاں حقیقت شناس

انبیاء و رسل ہیں۔ اس لیے ان کی پیروی کیے بغیر چارہ نہیں۔

پابندیاں جہاں عائد کی جاتی ہیں وہ اخلاقی اور عملی تربیت کا میدان ہے۔ جسمانی نشوونما اور بحالیٔ صحت کی خاطر خود یہ حضرات اپنے بچوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ غذا پر، لباس پر، کھیل پر، اوقاتِ کار پر پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ ضابطہ کار مقرر کرتے ہیں اور اس کو وہ جبر خیال نہیں کرتے۔ مذہب بھی روحانی اور اخلاقی نشوونما کے لیے ایک تربیتی نصاب مقرر کرتا ہے۔ محمود و مذموم کا ضابطہ مقرر کرتا ہے۔ ترک و اختیار کا ایک قانون بناتا ہے اس طرزِ عمل کی معقولیت میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ مصالح کو نہ سمجھنا کم فہمی کی دلیل ہے۔ اس کو جبر نہیں کہتے۔

سخن شناس نئی دلبرا! خطا اینجاست

۳۔ آزادی

مغربی نظامِ تعلیم میں آزادی ایک بہت اہم قدر ہے۔ جس کے حصول کے لیے افراد کو تیار کیا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت اس بات کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ افراد کو معاشرہ میں مکمل طور پر آزادی حاصل ہونا چاہیئے۔ مذہب، اخلاق اور معاشرتی ضابطوں کو یہ لوگ قید اور بندش تصور کرتے ہیں۔ ان کو آزادی کے راستے میں کانٹے تصور کرتے ہیں۔ اس لیے یہ مذہب اور اخلاق کی مخالفت کرتے ہیں۔

بلاشبہ آزادی انسان کا فطری حق ہے۔ آزادی کے بعد ہی ایک شخص اخلاقی تقاضے پورے کر سکتا ہے اور معاشرتی فرائض انجام دے سکتا ہے۔ جبر و ستم کے ماحول میں شخصیت کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ وہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہر فرد کو معاشرہ کے اندر تمام

بنیادی حقوق مکمل طور پر حاصل ہونے چاہئیں، تاکہ وہ فریضۂ حیات انجام دے سکے۔ ان حقوق کے بغیر اس کی آزادی نامکمل رہ جاتی ہے۔ اس لیے افراد کی آزادی سے کسی معقول آدمی کو ذرہ بھر اختلاف نہیں ہے۔

اصل حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو آزادی کا تصور مذہب نے عطا کیا ہے۔ ایک خدا کے بندے بن جانے کے بعد ہی بندوں کے درمیان حقیقی اخوت، مساوات اور آزادی پیدا ہو سکتی ہے۔ انسان کے وضع کردہ نظاموں میں جہاں ایک فرد یا چند افراد کا مجموعہ خدائی کے تخت پر براجمان ہوتا ہے۔ وہاں بس نام کی آزادی ہوتی ہے، ورنہ بالفعل سارے انسان حکمرانوں کے غلام بن جاتے ہیں۔ اسلام نے مساوات اور اخوتِ آدم کا نعرہ بہت پہلے اور بہت زور سے لگایا ہے۔ سارے عالم میں آج اس کی صدائے بازگشت سُنی جا رہی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس مشفقانہ انداز میں اخوت کا درس دیا ہے۔ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

اَلْخَلْقُ کُلُّهُمْ عِیَالُ اللهِ وَ اَحَبُّهُمْ اِلَیْهِ اَنْفَعُهُمْ لِعِیَالِهٖ

یعنی "ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ وہ آدمی اللہ کو سب سے زیادہ پیارا ہے جو اس کے کنبے کو فائدہ پہنچائے اور ہمدردی کرنے میں پیش پیش ہو۔"

جدید دور میں روسو کا یہ جملہ آزادی کا منشور سمجھا جاتا ہے "انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن آج ہر جگہ وہ پابندِ سلاسل ہے۔" روسو سے صدیوں سال قبل اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا تھا:

مُنْذُ اسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَ قَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا۔

یعنی "تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا۔"[1]

ایرانیوں کے خلاف عربوں کی پہلی جنگ قادسیہ (۶۳۶ء) کے موقعہ پر ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سفیر مغیرہ بن شعبہ نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے:

"ہم سب عرب برابر ہیں۔ کوئی کسی کو غلام نہیں بناتا۔"[2]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلامی مساوات کا عملی مظاہرہ کیا۔ شام کا عیسائی بادشاہ جبلہ بن ایہم غسانی مسلمان ہو گیا۔ وہ حج پر آیا تھا اور طواف کر رہا تھا۔ ایک دیہاتی عرب کا پیر اس کی لٹکتی ہوئی عبا پر پڑ گیا۔ جبلہ نے مڑ کر اس کے ایک تھپڑ رسید کیا۔ اس دیہاتی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جا کر شکایت کی۔ مقدمہ کو سُن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قصاص کا فیصلہ سُنا دیا۔ جبلہ نے کہا "کیا آپ معمولی انسان کا بدلہ ایک بادشاہ سے لیں گے؟" (اَتَقْتَصُّ لِلسُّوْقَةِ مِنَ الْمُلُوْكِ) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا "اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا ہے۔" (اَلْاِسْلَامُ سَوّٰی بَیْنَكُمَا)۔

اسلام کے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۶۵۶ء تا ۶۶۱ء) نے تمام انسانوں کو آزادی کا یہ منشور سُنایا تھا "کسی دوسرے انسان کے غلام نہ بنو، اللہ نے تمھیں آزاد پیدا کیا ہے۔" درحقیقت

---

[1] بہت ممکن ہے روسو نے یہ تصور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول ہی سے اخذ کیا ہو۔ اس نے اسلام کا کافی مطالعہ کیا تھا۔
دیکھو:- Islam and the Social Contract, by Prof. Awais Ahmad, Karachi

[2] تاریخ طبری جلد چہارم صفحہ ۱۰۹ طبع مصر۔

تاریخ عالم میں اسلام نے سب سے پہلے انسانی آزادی کی دعوت عام دی ہے۔

مل (J.S. Mill, 1806-1873) کی کتاب "دربیانِ آزادی" (On Liberty, 1859) مغرب میں آزادی کی انجیل سمجھی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"مہذب معاشرہ میں افراد پر ان کی مرضی کے خلاف طاقت کا استعمال صرف ایک صورت میں جائز ہے کہ اس سے مقصود دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بچانا اور محفوظ رکھنا ہو۔ ورنہ ہر فرد اپنے اُوپر، اپنے جسم پر اور اپنے ذہن پر مقتدرِ اعلیٰ ہے۔"

اس طرح مل نے مغرب کو بے قید آزادی کا راستہ دکھایا۔ اس سے قبل ایڈمنڈ برک (Edmond Burke, 1729-1797) معاشرہ میں آزادیوں کی حد بندی صحیح طریقہ پر کر چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"انسان جس قدر ضبطِ نفس قبول کرتا ہے، اور اپنی خواہشات پر اخلاقی بندشیں عائد کرتا ہے، اسی قدر وہ معاشرتی آزادیوں کا مستحق بن جاتا ہے۔"

مگر اخلاق سے بیزار مغربی معاشرہ نے برک کو مسترد کر دیا اور مل کو قبول کر لیا۔

مغرب میں آزادی کا تصوّر فطری حدود سے تجاوز کر گیا ہے۔ آزادی کے ڈانڈے مادر پدر آزادی سے جا کر مل گئے ہیں۔ روسو اور دوسرے مفکرین نے جوشِ جذبات میں آ کر ہر قسم کی پابندیوں، بندشوں اور ضابطوں کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ فلسفہ وجودیت (Existentialism) کا یہودی نژاد فلسفی ژاں پال سارتر تو اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ انسانوں

کی آزادی کے لیے وہ خدا، مذہب اور اخلاق کے انکار کو ضروری سمجھتا ہے۔ ناعاقبت اندیشی سے ان سب لوگوں نے ایک ایسی تحریک کو ہوا دی جس نے پروان چڑھ کر معاشرہ کے تار و پود بکھیر دیئے۔ مذہب و اخلاق سے مکمل رہائی حاصل کر لی۔ ضبطِ نفس کی بندشیں ٹوٹ گئیں۔ عریانی، ہوس رانی اور کام جوئی دل پسند مشاغل بن گئے۔ نئی نسل نے غضب کر دیا۔ تمام مسلّمہ انسانی آداب اور معاشرتی روایات پر قینچی چلا دی۔ اب وہ فی الواقع مادر پدر آزاد ہے۔

مذہب اور اخلاق سے بے نیاز ہو کر آزادی کا عموماً مظاہرہ اس انداز میں ہوتا ہے کہ فرد اور معاشرہ دونوں شرفِ انسانیت کی بلند سطح سے گر کر حیوانیت اور بہیمیت کی سطح پر پہنچ جاتے ہیں۔ اخلاقی قانون توڑنے کے بعد خود غرضی اور جنگل کا قانون —— جس کی لاٹھی اس کی بھینس —— نافذ ہو جاتے ہیں۔ نتیجۃً کشمکش، تصادم اور جنگ و پیکار رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے مغربی معاشرہ کو جنگ و پیکار سے کسی صورت میں مفر نہیں ہے۔

فرد اور اجتماع

عمرانی حکماء کے سامنے سب سے زیادہ سنگین تین مسئلے رہے ہیں: فرد کی آزادی کی صحیح حقیقت، عورت کا معاشرہ میں صحیح مقام اور فرد اور اجتماع کے درمیان روابط کی پابندی۔ ان مسائل کو حل کرنے میں کسی غلطی کا ارتکاب کرنے سے یا انتہا پسندی کی روش اختیار کرنے سے ماضی میں بہت سی قومیں ہلاکت کے غاروں میں دفن ہو چکی ہیں۔ انحراف عموماً آزادی کے مبالغہ آمیز تصوّر سے پیدا ہوتا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی آزادی کے پس پردہ خود غرضی اور خود سری کے جذبات کی موجیں تلاطم خیزیاں کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ راہ بالآخر انسان کو حیوانیت اور بہیمیت کی تاریکیوں میں دھکیل دیتی ہے

معاشرہ کے افراد جب بے قید آزادی اور خودسر بے راہ روی پر گامزن ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ خود فراموشی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنی بنیادوں پر تیشہ زنی کر رہا ہے اور خود اپنی قبر کھود رہا ہے۔

زندگی بسر کرنے کے لیے، اور شخصیت کی تکمیل کے لیے ہر فرد ایک سازگار معاشرہ کا طلب گار ہے۔ معاشرہ کا وجود انسان کی فطرت کا تقاضا ہے فرد کو معاشرہ کے اندر دوسرے افراد کے ساتھ زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ باہمی تعاون حاصل کرنے کے لیے، اجتماعی فلاح حاصل کرنے کے لیے اور باہمی تصادم سے بچنے کے لیے معاشرہ میں شامل افراد کو برضا و رغبت چند پابندیاں قبول کرنا پڑتی ہیں۔ یہ پابندیاں معاشرہ کے بالاتر مفاد میں ہوتی ہیں۔ پابندیاں قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔

اگر انسان تمدن پسند نہ ہوتا، اگر انسان منفرد زندگی گزارتا ہوتا تو شاید مکمل آزادی کا تصور قابلِ قبول ہو سکتا تھا۔ اجتماعیت پسندی کے ساتھ کامل آزادی کا تصور ہرگز نہیں نبھ سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص فنِ جیب تراشی یا بچوں کو اغوا کرنے کے طریقوں کی تعلیم دینے کے لیے ایک سکول کھول لے اور کہے کہ میں آزاد ہوں، جو چاہوں کروں، تو کوئی ہوش مند شخص اور کوئی زندہ معاشرہ اس قسم کی آزادی کو ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔ بلکہ پہلی

۱؎ روس میں انقلاب کے بعد ایک خاتون ماسکو کے چوراہے پر وسط میں محوِ خرام تھی۔ ٹریفک کے سپاہی نے اس کو ٹوکا۔ عورت نے جواب دیا۔ اب تو زار کی حکومت ختم ہو گئی۔ کیا اب بھی یہ پابندیاں برقرار رہیں گی۔ اس عورت کے ذہن میں آزادی کا مفہوم ہر قسم کی پابندیوں کے ختم ہو جانے کا تھا۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو بے قید آزادی کے خواہاں ہیں۔

فرصت میں اس اقدام کا خاتمہ کر دے گا، خواہ اس سے ارتکاب جرم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ جو لوگ گندگی کے ڈھیر سڑک پر برداشت نہیں کر سکتے ہیں، وہ اخلاقی تعفن اور گندگی کے بھبکارے معاشرہ کے اندر برداشت کیے ہوئے ہیں۔

فرد کی شخصیت کی تکمیل معاشرہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ معاشرہ کا قیام اور استحکام اخلاقی قدروں کی پیروی اور ضابطوں کی پابندی میں پنہاں ہے۔ یہ پابندیاں قبول کر کے ہی ایک فرد صحیح خطوط پر ترقی کر سکتا ہے۔ ہاں البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ فرد اور معاشرہ کے لیے قانون سازی کرنا ناقص العقل انسانوں کا کام نہیں ہے۔ یہ ہمہ داں اور ہمہ خیر مقتدر اعلیٰ ہستی کا کام ہے۔ اپنی خلقی کمزوری کی وجہ سے انسانی قانون سازی ہمیشہ ناقص ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات یہ نقص ایک عرصہ کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ ہمہ داں ہستی ہی افراد اور معاشرہ کے تقاضوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کر سکتی ہے۔ بہرکیف بے قید آزادی معاشرہ کے لیے مہلک ہے۔ یونان، روما اور جدید مغربی معاشرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ معاشرہ میں عدل و توازن کی فضا برقرار رکھنے کے لیے پابندیاں قبول کرنا ناگزیر ہے۔

۴۔ واقعیت پسندی

واقعیت پسندی بھی مغربی نظامِ زندگی کی ایک اہم قدر ہے۔ اگرچہ بعض مفکرین پہلے بھی فطرت پرستی کے نام سے اس کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ لیکن جب چارلس ڈارون Charles Darwin, 1809-82 نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اصل الانواع" Origin of Species ۱۸۵۹ء میں شائع کی تو اس کتاب نے اہلِ مغرب کے دل و دماغ پر

غیر معمولی اثر ڈالا۔ اس نے مغربی ذہن کو ایک نئے رُخ پر ڈال دیا۔ مسئلہ ارتقاء کے زیرِ اثر انسان ایک حیوان قرار پایا، بس ذرا اعلیٰ درجہ کا حیوان۔ کارل مارکس نے اس حیوان کے لیے سب سے زبردست محرکِ عمل خواہش شکم پُری کو قرار دیا۔ فرائڈ نے اس حیوان کے لیے سب سے زبردست محرکِ عمل جذبۂ شہوت رانی کو قرار دیا۔ انسان کی خواہشوں اور آرزوؤں کی تشریح اور تعبیر حیوانی زندگی کو معیار مان کر ڈالی گئی۔ کسی عمل کے صحیح یا غلط ہونے کی کسوٹی حیوانی فطرت کو سمجھ لیا گیا۔ انسان کا مفہوم حیاتیاتی رہ گیا۔ انسان جبلتوں، طبعی رجحانات اور خواہشاتِ نفس سے عبارت بن گیا۔ انسانی زندگی کا مقصد فطری قوتوں کو فروغ دینا اور فطری خواہشوں کی تکمیل کرنا ٹھہرا۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ انسان تنومند ہو، فربہ ہو، توانا ہو، ہشاش بشاش ہو۔ یہ خیال عام ہو گیا کہ انسان کے اندر تمام تقاضے اور خواہشات اپنی فطرت میں برحق ہیں۔ ان جذبات اور آرزوؤں کو برملا اور بے محابا اظہار اور تکمیل کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ معاشرہ کی عائد کردہ پابندیاں غلط ہیں۔ مذہب اور اخلاق کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کی سخت مخالفت شروع ہو گئی۔ ان حالات میں فرائڈ کے فلسفۂ جنسی نے غضب کر دیا۔ اس کے فلسفہ کے زیرِ اثر ہوس پرستی اور شہوت رانی نے مغربی معاشرہ میں ترقی حاصل کر لی۔ اب انسانیت کی معراج حیوانی بے حیائی اور عریانیت قرار پائی۔

فطرت پرستی کی اس تحریک کے بڑے دُور رس نتائج نکلے۔ حیوانی خواہشات کی تکمیل کا راستہ بے جھجک کھل گیا۔ ہوس رانی کو کُھلی چھٹی مل گئی۔ شرم و حجاب کا پردہ تار تار ہو گیا۔ عزت و ناموس کو موت آ گئی۔ اباحیت Libertinism کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔ زوجین میں غیر وفاداری عام ہو گئی۔ خاندانی نظام میں خلل واقع ہو گیا۔ معاشرہ گندگی اور تعفن سے

بھر گیا۔ اس کے بعد زنا کاری، جسم فروشی اور اغلام بازی کو طبعی افعال قرار دے کر سندِ جواز بخش دی گئی۔ معلوم نہیں قتل، اغوا جیسے طبعی افعال کیوں ابھی تک سندِ جواز سے محروم ہیں۔

بلاشبہ فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو دبانا یا کچلنا یا ان سے اغماض برتنا مہلک ہے، جیسا کہ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کے زیرِ اثر ہوتا رہا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ حیوانی خواہشات اور جبلتوں کو کھلی چھٹی دے دینا بھی اتنا ہی مہلک ہے۔ اہلِ مغرب کی انتہا پسندی بھی عجیب شے ہے۔ یا تو وہ شدت تھی کہ گناہِ آدم کی بدولت ننھے معصوم بچوں کو بھی گناہ گار تصور کیا جاتا تھا اور ان پر سختی روا رکھی جاتی تھی، یا یہ غلو ہے کہ گویا انسان کی فطرت میں کوئی "حکیم" یا "ولی" پوشیدہ ہے۔ حجابات کا پردہ اُٹھتے ہی وہ ظاہر ہو جائے گا اور تمام حالات درست ہو جائیں گے اور ایک مثالی معاشرہ قائم ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت چند داعیات اور جبلتوں سے عبارت ہے۔ یہ امکاناتِ عمل ہیں۔ یہ بذاتِ خود نہ شر ہیں نہ خیر۔ اخلاق سے بے نیاز ہو کر ان کو بے محابا اظہار کا حق دے دینا معاشرہ کے لیے تباہ کن ہے۔ معاشرہ کے لیے صرف وہی داعیات اور رجحانات نافع ہوتے ہیں جو مذہب اور اخلاق کی قدروں کے تحت پروان چڑھتے ہیں۔

فلسفۂ واقعیت پسندی کی رُو نے ایک منفی رُخ بھی اختیار کیا ہے معیاریت Normativeism اور مثالیت Idealism کے نام پر جو تقاضے اور مطالبے مذہب اور اخلاق پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ ان سب کو غیر واقعی قرار دے دیا۔ فرائیڈ نے ان کی عجیب و غریب توجیہہ پیش کی۔ وہ کہتا ہے۔ معاشرہ میں رائج پابندیاں افراد کو آزاد شہوت رانی کا موقع فراہم نہیں کرتیں۔ یہ جذبات ذہن میں

مجبور ہو کر نئی نئی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ مذہب، اخلاق، فلسفہ، ادب وغیرہ سب ایسی ہی منحرف شدہ خواہشات ہیں۔ اس کے خیال میں یہ علوم غیر واقعی ہیں، محض خوش گمانیاں ہیں۔

تفکر، فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے، جو حیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔ افکار کسی بھی نوع کے ہوں اور کسی بھی شکل میں ہوں، بہر حال معیاریت اور مثالیت کو پیش کرتے ہیں۔ مذہب، اخلاق، فلسفہ، ادب وغیرہ سب کسی نہ کسی نوع کی مثالیت کو پیش کرتے ہیں۔ یورپ کے جدید مفکرین حیوان پرستی اور واقعیت پسندی کے نام پر مثالیت پسندی کے مخالف بن گئے ہیں۔ معیاریت اور مثالیت پسندی کو وہ کج فہمی اور کج بینی قرار دیتے ہیں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مذہب بیزاری کی جو فضا یورپ پر چھائی ہوئی تھی، اس نے بھی اس مفہوم کو تقویت پہنچائی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ فطرتِ انسانی کا صحیح ادراک ہے؟ کیا انسان کے اعمال و افعال کی یہ صحیح تعبیر ہے؟ جس شخص نے بھی انسان کے اعمال افعال پر غور کیا ہے اور انسانی تہذیب و تمدن کی طولانی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات جانتا ہے کہ انسان فطرتاً مثالیت پسند واقع ہوا ہے۔ انسان کو ہمیشہ بر سے بہتر اور بہتر سے بہترین کی طلب رہتی ہے۔ وہ ہر آن خوب سے خوب تر اور خوب تر سے خوب ترین کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس جذبہ اور محنت کا نتیجہ ہے کہ انسان نے ہزاروں سال قبل لکڑی کا پہیہ ایجاد کر کے گاڑی پر سفر کیا تھا، آج لوہے کا پہیہ ایجاد کر کے وہ ریل پر سفر کر رہا ہے۔ پہلے جانوروں کی قوت استعمال کرتا تھا، پھر بھاپ کی طاقت استعمال کی، پھر بجلی کی طاقت استعمال کی اور اب جوہری توانائی استعمال کر رہا ہے۔ پہلے پتوں سے جسم کو ڈھانکا، پھر اون کے کپڑے پہنے، پھر روئی کے کپڑے پہنے، آج تالیفی ریشوں Synthetic Fibres سے لباس بنا کر پہن رہا ہے

علوم کا ہر شعبہ، تمدن کا ہر گوشہ ارتقا پذیر ہے۔ یہ سب کچھ انسان کے

نہ تھکنے والے، نہ بجھنے والے جذبۂ خوب تر کا عملی مظاہرہ ہے۔ صدیوں سے انسانی فطرت کا یہ ریکارڈ موجود ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا کوئی مردِ معقول، انسانی فطرت کی مثالیت پسندی کا انکار کر سکتا ہے؟

۵۔ زمانہ پرستی

مغربی نظامِ حیات کی ایک معروف قدر "زمانہ پرستی" ہے۔ اس کا اظہار عموماً اس چلتے ہوئے جملے سے کیا جاتا ہے کہ زمانہ کا ساتھ دو۔ کبھی کہا جاتا ہے ؎

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی[1]

اس سلسلے میں انگریزی زبان کے شاعر ٹینی سن TENNYSON ۱۸۰۹-۹۰ کا ایک شعر بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔ گویا یہ کوئی حرف منزل من اللہ ہے:-

Old order changeth yeilding place to new,

lest a good custom may not corrupt the World

"قدیم نظام تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ نیا نظام اس کی جگہ لیتا رہتا ہے، تاکہ ایک اچھا طریقہ (طولِ مدت کے باعث) دنیا کو خراب نہ کر ڈالے۔"

ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے قانون بقائے اصلح Survival of the fittest سے اس کو مزید تقویت ملی۔ جو قومیں مادی دوڑ دھوپ میں آگے ہیں، وہ کامیاب ہیں اور بامراد ہیں، اور جو قومیں کشمکشِ حیات میں پیچھے رہ گئیں، وہ ناکام ہیں اور شکست خوردہ

---

[1] اقبال نے اس تصور کی تردید کی ہے ؎

حدیثِ بے خبراں ہے با زمانہ بساز — زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

ہیں۔ یہاں سے ہر جدید کے لیے برتر اور ہر قدیم کے لیے بدتر ہونے کی دلیل فراہم کی گئی، اور یہ کلیہ وضع کر لیا گیا کہ ہر جدت خیر ہے اور ہر قدامت شر ہے۔ دورِ جدید کی ہر شے خیر ہے اور دورِ قدیم کی ہر شے ناکام اور شر ہے۔ خیر و شر کا یہ مادی اور زمانی پیمانہ مغرب کے لادینی ذہن سے ہم آہنگ تھا، اس لیے اس کو فروغ حاصل ہوا۔

اسی نہج پر غور و فکر کرتے ہوئے مغربی مفکرین نے فلسفہ پیش کیا کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔ ثبات اور دوام یہاں کسی شے کو حاصل نہیں۔ صرف مادی دنیا میں یہ ضابطہ کار نافذ نہیں ہے، بلکہ معنوی دنیا میں بھی یہی کلیہ نافذ ہے۔ کسی عقیدہ، کسی قدر، کسی نظریہ کو یہاں خلود اور دوام حاصل نہیں ہے۔ ہر شے تغیر پذیر ہے۔ اور ہر جدید، قدیم سے افضل ہے۔ قدیم ہونا ذلت اور رسوائی کی علامت ہے، اور جدید ہونا خوبی اور کمال کی علامت ہے۔ ترقی پسند Progressive ہونا قابلِ تعریف ہے اور رجعت پسند Reactionary ہونا قابلِ مذمت ہے۔ حتیٰ کہ مغربی معاشرہ میں سن رسیدہ اور عمر رسیدہ لوگوں کی توہین اور تحقیر کی جانے لگی، اور نوخیز اور نوجوان ہونا عزت و توقیر کا مستحق بن گیا۔

نظریۂ ارتقاء کا تعلق عالمِ حیوانات سے ہے جہاں ترقی کا معیار جسمانی کارکردگی اور اعضاء کی برتری ہے۔ عالمِ انسانیت میں ترقی کا معیار عقل و فکر کی برتری، اخلاق و کردار کی بلندی، معیشت و معاشرت کی شستگی اور شائستگی سے ہے۔ اس لیے نظریۂ ارتقاء کو عالمِ انسانیت پر منطبق کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ عالمِ عمرانیات Sociology میں اس کو منطبق کرنا مغربی ذہن کی خوش گمانی ہے۔

ارتقائی مفکرین کا یہ دعویٰ کہ کائنات کی ہر شے ارتقا پذیر ہے، مادیات میں خواہ درست ہو، عالمِ معنویت اور عالمِ افکار و اقدار میں ہرگز درست نہیں ہے۔ یہاں حق حق ہے، خواہ کتنا ہی قدیم ہو، باطل باطل ہے، خواہ کتنا ہی جدید ہو۔ سائنس دان اس امر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جدید سائنس کی پُرعظمت اور پُرشکوہ عمارت ریاضی کی بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہے، اور کوئی سلیم الذہن آدمی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ ریاضی کے تمام بنیادی قاعدے غیر مبدل ہیں اور صدیوں سے غیر مبدل رہے ہیں۔ اسی طرح فلسفہ کا پُرہیبت محل منطق کی بنیادوں پر تعمیر ہوا ہے، اور منطق کے بنیادی اصول بھی غیر مبدل رہے ہیں۔ ریاضی کے جو قاعدے حکیم فیثاغورث Pythagores, 582-500 B.D. اور حکیم ارشمیدس Archimedes, 282-212 B.D. نے معلوم کیے تھے۔ نہ تو ان میں آج تک کوئی تغیر واقع ہوا ہے، نہ وہ متروک قرار دیے گئے ہیں۔ منطق کے جو قواعد ارسطو Aristotle, 384-322 B.D اور حکیم بوعلی سینا Avicenna, 930-1080 A.D. نے دریافت کیے تھے وہ آج تک برقرار ہیں۔ ان میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ اُدھر سائنس کی دنیا میں آئیے۔ آئن سٹائن کا دعویٰ ہے کہ کائنات میں روشنی کی رفتار ناقابلِ تغیر ہے۔ نظریۂ اضافیت کے مطابق ہر شے کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ مگر روشنی کی رفتار وہاں بھی ناقابلِ تغیر ہے۔ ڈارون کی دنیا میں علم الحیات کے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ جرثومہ حیات Gene ناقابلِ تغیر ہے۔ سائنس کا عام اصول جزئیات کے مطالعہ کے بعد کلیات اخذ کرنا ہے۔ کلیات کے مفہوم میں عمومیت کے ساتھ ساتھ دوام کا تصور بھی شامل ہے۔ اگر ہر شے کے متغیر ہونے کے اصول پر صدقِ دل سے سائنس دان

یقین رکھیں تو پھر سائنس کے کسی شعبے میں کسی اصول اور کسی کلیہ کا وجود نہ ہو۔ سائنس محض جزئیات کا ڈھیر ہو، مدون علم نہ بن سکے۔ اصول اور کلیات نہ ہوتے تو نہ سائنس وجود میں آتی، نہ فلسفہ موجود ہوتا۔ ان حقائق کی موجودگی میں اہلِ مغرب کا یہ دعویٰ کرنا کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے، بس ایک دعویٰ ہے بلا ثبوت۔

عالمِ افکار میں جدید اور قدیم کی بحث غیر ضروری بلکہ لایعنی ہے۔ یہاں اصل بحث حق و باطل، خیر و شر، نافع و مضر کی ہے۔ کوتاہیٔ علم اور بات ہے، ورنہ آج کے جدید علم بھی قدیم ہی ہیں۔ مثلاً عام طور پر لوگ اشتراکیت کو جدید ترین نظامِ حیات تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ تصور بھی ڈھائی ہزار سال قدیم ہے۔ افلاطون Plato, 437- B.D نے اپنی کتاب ریاست Republic میں اسپارٹا Sparta, 400 B.D. کا ذکر کیا ہے۔ وہاں کا نظامِ حیات زر، زمین کی کامل مساوات پر قائم تھا۔ یہی وہ معراج ہے جس تک پہنچنے کی تمنا آج کا ہر اشتراکی اپنے دل میں رکھتا ہے۔ پھر کیا یہ بات صحیح ہے کہ اشتراکی نظام جدید ترین نظامِ حیات ہے۔ اصل حقیقت علامہ اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے الفاظ میں یہ ہے ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

زمانہ پرستی پر یقین کرنے کے بعد انسان خود کو مجبورِ محض سمجھنے لگتا ہے۔ پھر اس کا فرض یہ قرار پاتا ہے کہ وہ زمانہ کے بہاؤ کے ساتھ بے چون و چرا بہنے کے لیے آمادہ ہو جائے اور کسی قسم کی مزاحمت نہ کرے۔ بہت ممکن ہے انیسویں صدی کی استعمار پسندی Colonialism نے مغربی ذہن کو یہ دلیل سجھائی ہو کہ یہ فلسفہ مغلوب اقوام کو مفتوح

بنانے کا اچھا نسخہ ہے۔ اس نسخہ کے استعمال کے بعد مغلوب قومیں اہلِ مغرب کی حاکمیت کو نہ صرف دل و جان سے مان لیں گی۔ بلکہ ذہن و قلب کے اطمینان کے ساتھ مغرب کی غلامی قبول کر لیں گی اور مغرب کی نقالی پر فخر کریں گی ؏

کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

حقیقتِ حال یہ ہے کہ انسان بڑی حد تک خود مختار ہے۔ یہ کائنات یہ مدتِ حیات انسان کے دستِ تصرف میں وہ خام مواد ہے جس سے وہ اپنے ذہن کی مثالی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ اس دنیا میں انسان کا کردار مجبور اور مجبور انسانی کردار نہیں ہے، بلکہ وہ متصرف، فعال اور خود مختار ہے۔ بندہ اور خدا کے درمیان مکالمے میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے:

؎ گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

انسان اپنے خیال اور آرزو کی دنیا کو عالمِ شہود میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی غرض کے لیے اس نے معیشت و معاشرت، تہذیب و تمدن کی فلک بوس عمارت کھڑی کر دی ہے۔ یہ اس کے داخلی تصورات کی خارجی تصویر ہوتی ہے۔ انسان کی دائماً یہ کوشش رہتی ہے کہ خارجی دنیا میں اس کی معنوی دنیا کا عکس نظر آئے۔ انسانی ذہن کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ اس لیے وہ ہر دم، ہر طور اور ہر رنگ ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں منہمک رہتا ہے۔ انسان ہرگز زمانہ کا محکوم نہیں ہے، بلکہ وہ زمانہ کا حاکم ہے ؎

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایّام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

زمانہ پرستی، نقالی اور خوشامد سے ہادیٔ انسانیت حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، آپ کا ارشاد ہے:

"لَا يَكُنْ أَحَدُكُمْ إِمَّعَةً يَقُولُ أَنَا مَعَ النَّاسِ،
إِنْ أَحْسَنُوا أَحْسَنْتُ وَإِنْ أَسَاءُوا أَسَأْتُ
وَلٰكِنْ وَطِّنُوا أَنْفُسَكُمْ أَنْ تُحْسِنُوا إِنْ
أَحْسَنَ النَّاسُ وَإِنْ أَسَاءُوا أَنْ تَجْتَنِبُوا
إِسَاءَتَهُمْ۔"

"تم میں سے کوئی شخص ہاں میں ہاں ملانے والا نہ بنے اور کہے کہ میں تو لوگوں کے ساتھ ہوں۔ اگر وہ نیکی کریں گے میں بھی نیکی کروں گا، اور اگر وہ برائی کریں گے تو میں بھی برائی کروں گا۔ نہیں بلکہ اپنے نفس کو نیکی پر جماؤ۔ جب لوگ نیکی کریں، اور جب وہ برائی کریں تو تم برائی سے اجتناب کرو۔"

اصل بات یہ ہے کہ کوئی تہذیب نہ خیر محض ہوتی ہے اور نہ شر محض۔ خالص شر کو تو قیام و بقا ہے ہی نہیں بفحوائے آیۂ کریمہ:

إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (اسرائیل)

"تحقیق باطل مٹنے کے لیے ہی ہے"

باطل جب بھی سامنے آتا ہے، خیر کے ساتھ چمٹ کر آتا ہے۔ مغربی نظامِ حیات میں بھی اور ہر نظامِ حیات میں خیر اور شر کے اجزا باہم ملے جلے ہوتے ہیں۔ اس لیے مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کرنا، اس کے ہر رطب و یابس کو قبول کرنا محض بے عقلی اور اندھے پن کی بات ہے۔ ارفع اور اعلیٰ اقدارِ اخلاق کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کون سے اجزا حق ہیں اور کون سے باطل۔ کس کو اخذ کرنا چاہیے اور کس کو ترک۔ محض

جدید ہونا، حق ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

تمدن، معیشت اور معاشرت کے وہ اُمور جن کا تعلق انسان کی خارجی زندگی سے ہے، بلاشبہ ان میں مرورِ زمانہ کے ساتھ تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دنیا میں تیر و تلوار کا رواج تھا۔ پھر بندوق اور رائفل میدان میں آگئیں۔ آج کل بموں اور ٹینکوں کا دور دورہ ہے۔ ان ترقیوں کو قبول کرنے میں کبھی کسی معقول آدمی کو تامل نہیں ہوا۔ یہی حال دوسرے تمدنی تغیرات کا ہے۔ لیکن کیا کوئی ہوش مند انسان ان تغیرات کی بنا پر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ انسان کی جنگجویانہ فطرت میں تبدیلی آگئی ہے؟ جس جذبہ سے آدم کے بیٹے ہابیل اور قابیل لڑے تھے کیا آج وہ جذبہ ختم ہو گیا؟ ہتھیار ضرور تبدیل ہوتے رہے، مگر جنگی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انسان کی طبیعت یکساں رہتی ہے۔ البتہ اس کے خارجی اور مادی مظاہرات ضرور تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ انسان جن جذبات، داعیات اور جبلتوں سے عبارت ہے، وہ طبعی ہیں۔ وہ آج بھی وہی ہیں جو اوّل روز تھے۔ ارشادِ ربانی ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ
لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ (روم)

یہ اللہ کی خلقت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔
اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس لیے انسانی معاشرہ کی اخلاقی اور روحانی قدریں، جن کا تعلق انسان کی فطرت اور اس کی طبیعت سے ہے، وہ بھی ناقابلِ تغیر ہیں۔ خیر و شر کا پیمانہ زمانہ نہیں ہے، انسان ہے۔ صداقت زمان و مکان سے مطابقت کا نام نہیں ہے، بلکہ حقیقت سے مطابقت کا نام ہے۔

۶ - حرکت وجمود

مغربی مفکرین کا اس بات پر بے حد اصرار ہے کہ ان کی ترقی کا ضامن نظریۂ حرکت ہے۔ انھوں نے کائنات میں اور عالمِ افکار میں نظریۂ سکون وثبات کو رد کر دیا ہے، اور اس کی جگہ نظریۂ حرکت وتغیّر قبول کر لیا ہے۔ اس لیے وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ باقی ساری دنیا ابھی تک نظریۂ سکون وثبات کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے، اس لیے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئی۔ جس حد تک آج کل وہ مغربی نظریات قبول کرتے جا رہے ہیں، اسی قدر ان کے اندر بھی ترقی ہو رہی ہے۔ گویا سکون وثبات کا نظریہ جمود وزوال کا، اور تغیر وتبدل کا نظریہ ترقی وعروج کا ضامن ہے۔ اہلِ مغرب اس استدلال پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

اگر ترقی سے مراد زمین پر غلبہ ہے، اقوامِ عالم پر حکمرانی ہے، تو ماضی میں دوسری بہت سی اقوام اس عزت کی مستحق قرار دی جا چکی ہیں۔ مصری، اشوری، ایرانی، یونانی، رومی، عرب، تاتاری اور ترک بہت ساری اقوام اپنے اپنے دَور میں دنیا کے وسیع وعریض خطوں پر طویل عرصہ تک حکمرانی کر چکی ہیں۔

اگر ترقی سے مراد علوم وفنون میں سرگرمی دکھانا اور نام آوری حاصل کرنا ہے تو اس میدان میں بھی دنیا کی دوسری اقوام ہمسری کی دعوے دار ہیں۔ مصریوں نے کیمیا (ممی) اور ہندسی (اہرام) میں کمال حاصل کیا۔ بابلیوں نے ریاضی اور فلکیات میں ترقی کی۔ گھنٹہ، دن، مہینہ کی تقسیم وغیرہ ان کا ہی عطیہ ہے۔ یونانیوں نے فلسفہ اور طب میں نام پیدا کیا۔ رومیوں نے تعمیرات کے آثار چھوڑے ہیں۔ عربوں نے تاریخ نویسی، جغرافیہ اور اشاعتِ علم میں کمال حاصل کیا۔ ترک

اقوام نے نظمِ مملکت اور نظمِ ادارات Institutions میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ آخر یہ سب علمی سرگرمیاں ترقی ہی ہیں؟

اگر ترقی سے مراد ارضی انکشافات ہیں تو مسلمانوں کا پلہ یہاں بھی بھاری نظر آتا ہے۔ کوریا سے لے کر ناروے تک تینوں بڑے سمندروں کو انھوں نے کھنگال ڈالا تھا۔ کولمبس سے بہت پہلے وہ امریکہ پہنچ چکے تھے۔ برازیل کا لفظ آج تک بربروں کے قبیلہ برزالہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ امریکی غلہ مکئی کولمبس سے بہت پہلے مسلمان ساری دنیا میں پھیلا چکے تھے۔ واسکوڈی گاما کی ہندوستان تک رہبری کرنے والا امیر البحر احمد بن عبد الماجد اسد البحر تھا۔ کیپٹن کک کو آسٹریلیا کا راستہ دکھانے والا ملاح عبد اللہ گجراتی تھا۔

اگر ترقی سے مراد سائنسی اور مشینی ایجادات ہیں تو بلاشبہ اہلِ مغرب اس میدان میں بہت آگے ہیں۔ لیکن دوسروں کے یہاں بھی ان کے زمانہ کے لحاظ سے ایجادات ناپید نہیں ہیں۔ اندلس کے حکیم عباس ابن فرناس (۸۸۷ء) نے مندرجہ ذیل ایجادات کی تھیں۔

۱۔ اس نے پتھروں سے شیشہ بنایا تھا۔
۲۔ اس نے اپنے کمرہ میں نظامِ فلکی کی اشیاء تعمیر کی تھیں۔ اس لیے وہ کمرہ میں بیٹھ کر ہی ستاروں کی گردش کرتا رہتا تھا۔
۳۔ دنیا میں سب سے پہلے پَر لگا کر اڑنے کی اس نے کوشش کی تھی۔[۱]

اکبر بادشاہ کے وزیر میر فتح اللہ شیرازی (۱۵۸۸ء) نے "آئینِ اکبری" کی تصریح کے مطابق مندرجہ ذیل ایجادیں کی تھیں:-

۱۔ ایک ایسی دُوربین بنائی جس سے دُور کی چیزیں قریب نظر

---

[۱] تاریخ عرب (انگریزی) از پروفیسر فلپ حتی ص ۵۹۸

آتی تھیں۔

۲۔ ایک ایسی بندوق بنائی جس سے بیک وقت بارہ گولیاں خارج ہوتی تھیں۔

۳۔ ایک قلعہ شکن توپ بنائی۔

۴۔ ایک ایسا آئینہ بنایا جس میں آدمی کی شکل عجیب وغریب نظر آتی تھی۔

۵۔ ہوا سے چلنے والی پَوَن چکی بنائی۔ واضح رہے کہ ہالینڈ میں ہوائی چکیوں کا چلن اس کے بہت بعد میں ہُوا ہے۔

۶۔ پانی سے چلنے والی پن چکّی بنائی۔

۷۔ تمباکو پینے کے لیے حقہ ایجاد کیا جو عوام میں آج بھی بڑا مقبول ہے۔

ایسے کتنے ہی واقعات مختلف کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ مسلمانوں نے ان کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی، جتنی اہلِ مغرب نے دی۔ اگر وہ ان کو مرتب کر جاتے تو آج ہمارے ہاتھوں میں بھی ضخیم کتاب ایجادات ہوتی۔

گزشتہ ہزاروں سال سے تاریخ کے صفحات پر جو قومیں جلوہ گر ہوئی ہیں، جن کی علمی اور فنّی ترقیوں کی داستانیں تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کر لی ہیں۔ وہ سب نظریۂ سکون وثبات کی ماننے والی تھیں۔ مغربی اقوام کا دعویٰ ہے کہ نظریۂ سکون وثبات پہلی مرتبہ دنیا میں مغربی اقوام نے پیش کیا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ دعویٰ کرنا کہ نظریۂ سکون وثبات ترقی کی جانب رہنمائی کرتا ہے، ایک دعویٰ ہے بلا ثبوت۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ترقی کا تعلق محنت وجانفشانی سے ہے۔ مشرک ہوں یا موحد، شمالی ہوں یا جنوبی، تغیر کو ماننے والی ہوں یا سکون کو، جو بھی محنت کرے گا، سرگرمی دکھائے گا، وہ ضرور

علم وترقی سے ہم کنار ہوگا:

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى

"انسان کی کامیابی کا دارومدار کوشش پر ہے"

البتہ سر بر اقتدار آ کر ہر قوم ایسے نظریات کو تشکیل دیتی ہے جن سے اپنی برتری اور غلبہ کے لیے جغرافیائی اور طبعی اسباب پیش کرتی ہے۔ حالانکہ عالمی سیاق میں ایسے نظریات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یونانی ساری دنیا میں اپنی برتری کے دعوے دار تھے۔ ارسطو اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"دنیا کی آبادی بہ استثنائے اہلِ یونان، شمالی یورپ اور اہلِ ایشیاء پر منقسم ہے۔ شمالی یورپ والے شجاع ضرور تھے، لیکن سیاسی اور تہذیبی ترقی کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اہلِ ایشیاء مہذب ضرور تھے، لیکن شجاعت سے معرّا تھے۔ ان دونوں کے درمیان خالص یونانی وسطی درجہ رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسی سرزمین میں رہتے تھے جہاں کے حالات آب وہوا کے لحاظ سے تہذیب کی ترقی اور تحفظ مردانگی ہر دو اُمور کے لیے موزوں تھے۔ لہٰذا انہی کے مقدر میں دنیا کا مالک بننا لکھا تھا۔"[۱]

عروج اور عظمت کے جس منصب پر آج مغربی اقوام فائز ہیں، کبھی اندلس کے عربوں کا قبضہ تھا، اور یورپ کی قومیں وحشی اور غیر مہذب تھیں۔ ترقی اور عروج کے اسباب ان عربوں کی نگاہ میں یہ تھے۔

---

[۱] جغرافیہ اسٹرابو Strabo بحوالہ "اسلامی تہذیب" از بارتھولڈ اردو ترجمہ ص۱۹۔ انجمن ترقی اردو ہند۔

صاعد اندلسی لکھتا ہے

"چونکہ سورج کی شعاعیں براہِ راست ان کے (یورپ کے باشندے) سر پر نہیں پڑتی ہیں۔ موسم سرد رہتا ہے۔ فضا ابر آلود رہتی ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کے مزاج بھی سرد ہیں۔ ان کا مذاق بھی بھونڈا ہے۔ ان کے جسم بڑھ گئے ہیں۔ رنگ نکھرا ہوا ہے اور بال لمبے ہیں۔ لیکن ذہن کی تیزی اور نکتہ رس عقل ان کے پاس نہیں ہے۔ حماقت اور بے وقوفی ان میں عام ہے۔"[1]

ایک دوسرا عرب حکیم ابن حزم (۱۰۶۴-۹۹۴) اندلسی لکھتا ہے:

"جو شخص زبان اور کلام کے اسلوبوں کو نہیں جانتا وہ علوم و فنون تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور وہ قومیں جن میں غیر ترقی یافتہ زبان ہونے کے باعث علم کا کوئی تصور موجود نہیں ہے، ان میں علوم و فنون کے پنپنے اور ترقی پانے کے امکانات کا بھی فقدان ہے۔ چنانچہ بلادِ روم، صقالبہ (روس)، ترک، دیلم، سوڈان، بربر اور صحراؤں میں رہنے والے جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے برابر علوم و فنون سے محروم چلے آ رہے ہیں۔"[2]

بعینہٖ یہی دلائل نوبل انعام یافتہ سائنس دان الکسس کیرل مغربی اقوام کے عروج کے حق میں دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

---

[1] طبقات الامم از طلیطلی (۱۰۲۹ تا ۱۰۷۰) بحوالہ تاریخ عرب از پروفیسر حتّی صفحہ ۵۲۶

[2] علامہ ابنِ حزم اندلسی کا مکتوب المعارف لاہور نومبر دسمبر ۱۹۸۴ء

"سب سے زیادہ متمدن نسلیں مثلاً اسکنڈی نیوین سفید فام Scandinavian Blonde ہیں۔ صدیوں سے ایسے خطے میں آباد ہیں جہاں سال میں روشنی اور گرمی کم پڑتی ہے۔ فرانس میں شمالی حصہ کے لوگ، بحرِ روم کے ساحلی لوگوں سے برتر ہیں۔ فروتر نسلیں عموماً ایسے ممالک میں آباد ہیں جہاں روشنی تیز ہے اور آب و ہوا گرم ہے۔"[1]

ان بیانات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترقی کے لیے طبعی دلائل دینا قوموں کا قدیم وطیرہ ہے۔ ایک قوم سرد آب و ہوا کو ترقی کے لیے سازگار قرار دیتی ہے اور دوسری قوم گرم آب و ہوا کو ترقی کے لیے موزوں قرار دیتی ہے، اور سرد آب و ہوا کو ترقی کے لیے غیر موزوں بناتی ہے۔

۷۔ قوم پرستی

وطن پرستی اور قوم پرستی مغربی نظامِ حیات کی بہت ہی طاقتور قدریں ہیں۔ قوم پرستی کے نشہ سے افراد اور اقوام سب مخمور ہیں۔

انسانوں کو باہم جوڑنے کے لیے مذہب ایک زبردست قوت ہے۔ وہ وحدتِ الٰہ کے منطقی نتیجہ کے طور پر وحدتِ آدم اور وحدتِ عالم کا علم بردار ہے۔ اہلِ مغرب نے جب مذہب کو اس کے منصب سے معزول کر دیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ افراد اور معاشرہ کو مجتمع رکھنے کے لیے کوئی کلمۂ جامعہ، کوئی رشتۂ رابطہ تلاش کرنا چاہیے۔ قوم کی محبت اور وطن کی محبت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی

---

[1] Man the Unknown, by Alexis Carrel page 160, Bombay Editio

ہے۔ یورپ کے شاطروں نے اس جذبہ سے یہ کام لیا۔ وطن، نسل اور زبان کی وابستگی کے نام پر لوگوں کو جمع کیا گیا۔

انسان کی فطرت میں ایک دوسرا طاقتور جذبہ عبودیت کا ہے۔ اس جذبہ کے تحت انسان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کوئی اس کا محبوب ہو، کوئی اس کا مسجود ہو۔ جس کے سامنے وہ سجدہ ریز ہو، جس کے سامنے اپنی نیازمندی کا اظہار کرے، جس کی یاد اس کے دل کو گرمائے رکھے۔

کوئی آستاں ہو، کوئی بارگہ ہو
تقاضا جبیں کا، کوئی سجدہ گہ ہو

اصلاً تو یہ جذبہ حق تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کے لیے فطرت نے انسان کے اندر ودیعت کیا ہے، لیکن دوسری تمام جبلتوں کی طرح یہ بھی قابلِ انحراف Perversion ہے۔ اپنی اصل سے منحرف ہو کر اس جذبہ نے بت پرستی کی سینکڑوں شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس بت پرستی کی جدید ترین شکل قوم پرستی ہے۔

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مذہب کے خلا کو مغربی مفکرین نے وطن پرستی اور قوم پرستی کے جذبے سے پُر کیا۔ جو قلبی وابستگی عوام کو مذہب سے تھی، وُہی تعلق خاطر عوام کو وطن اور قوم سے پیدا ہو گیا۔ قوم کی جامع اور مانع تعریف بیان کرنے کی تمام کوششیں اب تک ناکام رہی ہیں۔ کارلٹن ھیس Carlton Hyes کے خیال کے مطابق قوم ایک مبہم لفظ ہے، اور قومیت ایک رمزیہ Mysterious لفظ ہے، جس کا مدلول متعین طور پر معلوم نہیں۔ پروفیسر کر Carr نے کہا ہے کہ قوم کی تعریف

بیان کرنا ناممکن ہے۔ ان دشواریوں کو سامنے رکھ کر پروفیسر ایمرسن Emerson نے قوم کی تعریف اس طرح کی ہے کہ انسانوں کا وہ گروہ جو خود کو ایک قوم سمجھے۔ ظاہر ہے یہ کوئی منطقی تعریف نہیں ہے۔ قوم پرستی کا مطلب ہٹلر کے وزیر داخلہ ہر فریڈرک Herr Fredric کے تاریخی الفاظ میں یہ ہے:۔

"ہٹلر کی خدمت کرنا، جرمنی کی خدمت کرنا ہے۔ اور جرمنی کی خدمت کرنا، خدا کی خدمت کرنا ہے۔ ہٹلر کا فیصلہ خیر ہے اور ابد تک خیر رہے گا۔ ہٹلر کی خدمت کے لیے ہر ذریعہ استعمال کیا جا سکتا ہے خواہ بظاہر وہ غیر اخلاقی فعل نظر آتا ہو۔"

گویا ہٹلر "سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ" کے درجہ پر فائز ہے اور اس کی اطاعت بے چون وچرا ہونی چاہیئے۔ یہ صرف اکیلے ہٹلر کی صدا نہیں ہے، بلکہ دنیا کے ہر قوم پرست حکمران کی یہی صدا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شاید اس صفائی اور بے باکی سے اپنا مدعا ظاہر نہ کر سکے۔

قوم پرستی کا بلنی تلاش کرنے میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ ھرڈر Herder, 1744-1803 نے قومیت کی بنیاد رسوم و رواج اور ثقافت کو قرار دیا۔ گوبینو Gobineau, 1816-1862 نے نسل کو قومیّت کی اصل قرار دیا، اور نطشہ Niezsche, 1844-1900 نے قومیّت کی بنیاد زبان کو قرار دیا۔ قوم پرستی کے تصوّر کو مقبول عام بنانے میں مفکرین سے زیادہ سیاست دانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ فکٹے Fichte, 1762-1814 اور ٹریٹسکے Treitschke, 1834-1896 نے جرمنی میں اور مازنی Mazzini, 1805-1873 نے اطالیہ میں قوم کو مظہر اللہ اور معبود بنا کر پیش کیا۔ سادہ لوح افرادِ

آدم اس بت کی بھی پجاری بن گئی۔

قوم پرستی کے زیرِ اثر صرف حکمران طبقہ ہی نہیں، بلکہ قوم کا ایک ایک فرد اپنی قوم کو دنیا کی ساری قوموں سے افضل اور برتر سمجھتا ہے۔ انگریز کہتا ہے:

"ہم دنیا کی شریف ترین نسل ہیں۔"

جرمن کہتا ہے:

"ہم شریف ترین قوم ہیں۔"

جاپانی کہتا ہے:

"ہم آسمانی باپ کے بیٹے ہیں۔"

یہودی کہتا ہے:

"ہم خداوند تعالیٰ کی چہیتی قوم ہیں۔"

پھر اپنی قوم کی برتری کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ دوسری قوموں کی تحقیر اور تذلیل کی جائے۔

ہندو برہمن کہتا ہے:

"تمام دوسری اقوام اچھوت اور ملیچھ (گندی، ناپاک) ہیں۔"

فرانسیسی ادیب مانٹیسکو Montesquieu, 1689-1755 لکھتا ہے:

"یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت سے بعید معلوم ہوتی ہے کہ اس نے سیاہ فام لوگوں کے جسم کے اندر پاکیزہ روح رکھی ہوگی۔"[1]

---

[1] ان سب کے برخلاف نبی عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اعلان ہے: "عربی کو غیر عربی پر اور غیر عربی کو عربی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ تم سب لوگ آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔" مزید فرمایا: "انسان کی بزرگی اور برتری کا تعلق اعمال سے ہے، تقویٰ سے ہے۔ جسم سے اور خون سے نہیں ہے۔"

قوم پرستی کی اصل روح، خود غرضی ہے، خود غرضی انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ اس کو اگر پھیلنے اور بڑھنے کا موقعہ دیا جائے تو یہ حد سے باہر ہو جاتی ہے۔ فرد، خاندان، قبیلہ، قوم اور وطن سب خود غرضی کے پھیلتے ہوئے دائرے ہیں۔ خود غرضی کا خاصہ، تصادم اور پیکار ہے۔ قومیت کا جذبہ نفرت کی غذا کھا کر پلتا ہے۔ دوسری قوم کو یا اقلیت کو حریف بنا لیا جاتا ہے۔ شکایات واقعی یا موہوم کا ایک دفتر اس کے خلاف جمع ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے قوم کے ایک ایک فرد کا مزاج برہم رہتا ہے۔ مستقل ذہنی تناؤ کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ ذہنی کشیدگی میں افواہیں اور غلط سلط بیانات کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتیں تصادم اور جنگ و پیکار پر ختم ہوتی ہیں۔ اس طرح غذا کھا کر قومیت کا عفریت طاقت ور بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ذہنی انحراف کی بدترین شکل ہے۔ جس کا نام قومیت ہے یا حُبّ الوطنی ہے۔ لوئی فشر Louis Fisher لکھتا ہے:

Patriotism is the last refuge of a Scoundrel

"جذبۂ حُبّ الوطنی ایک بدمعاش کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے۔"

آلڈوس ہکسلے Aldous Huxley لکھتا ہے:-

"قومیت نے ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ نیا مذہب انسانیت کے درمیان فساد اور تفریق پیدا کرنے کا بڑا طاقت ور ذریعہ بن گیا ہے۔ کوئی خدا پرست مذہب جو مساوات اور وحدتِ انسانی کا علم بردار ہے، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

مزید وہ لکھتا ہے:

"آج دنیا تقریباً پچاس[1] ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ یہ قوم پرستی ان کا سرکاری مذہب ہے یعنی بجائے خدا کے قوم کی پرستش کی جاتی ہے۔ قوم کو اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ ان پچاس دیوتاؤں میں سے ہر دیوتا کے پجاری باقی انچاس دیوتاؤں کے پجاریوں کو ملیچھ (ناپاک) تصور کرتے ہیں۔"

آگے چل کر لکھتا ہے:

"قومیت اخلاق کی تباہی کا سبب اسی طرح بنتی ہے کہ اس کی رُو سے عالمگیر انسانیت، احترامِ آدمیت اور خدائے واحد کا اعتقاد سب باطل قرار پاتے ہیں۔ ان کی بجائے انانیت Egotism اور خودکفالتی Self-sufficiency کے عقائد ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں نفرت اور جنگ وپیکار لازم بن جاتے ہیں۔"

انگریز فلسفی برٹرینڈ رسل Bertrand Russel اپنی کتاب تغیر پذیر دنیا کے لیے اُمید کی کرن Hope for the changing world میں رقم طراز ہے:-

"ہمارے زمانہ میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھنے میں مانع ہے وہ قومیت ہے۔ اس لیے قومیت نوعِ انسانی کی تباہی کے لیے سب سے بڑی قوت ہے۔ یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی قوم پرستی بڑی خراب شے ہے، لیکن اس کے اپنے وطن کی قوم پرستی اچھی شے

[1] اس وقت اقوامِ متحدہ کی ارکان ریاستیں پچاس تھیں۔

ہے۔"

واضح رہے کہ متمدن دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں صرف ایک ہی نسل کے لوگ آباد ہوں، یا ایک ہی زبان بولنے والے لوگ آباد ہوں۔ اس لیے قومیت نے ہر ملک میں اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اکثریت نے اقلیت کی زندگی ضیق میں کر دی ہے۔ اس لیے ہر جگہ اقلیتیں جُداگانہ وطن کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ہر ملک میں اندرونِ خانہ ایک نہ تھمنے والی سرد جنگ جاری رہتی ہے۔

وطن پرستی کی فطرت میں انتشار کی قوتیں پنہاں ہیں۔ تفریق در تفریق کا عمل وطنی قومیت کا خاصہ ہے۔ اس عملِ تفریق کی کوئی حد نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ ریاست طاقت ور ہے اور جہانگیریت کی راہ پر گامزن ہے۔ اس وقت تک اس کا اندرونی انتشار دبا رہتا ہے۔ جب ذرا کمزور پڑتی ہے تو یہ انتشار کی قوتیں سر اُبھارتی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپ کی قوموں کی شہنشاہیت ختم ہو گئی۔ اب ان کے اندر انتشار کا دیو پھنکار مار رہا ہے۔ علامہ اقبال نے بہت پہلے پیشین گوئی کر دی تھی ؎

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

کاش اہلِ مغرب سوچیں کہ مذہب کی جگہ اس بت کو بٹھا کر انھوں نے انسانیت کی کتنی تذلیل کی ہے، اور اس کو کن کن معاشرتی روگوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

درس گاہوں اور تعلیم گاہوں میں قوم پرستی کی پرورش کی جاتی ہے[1] اس

[1] پاکستان کے اسکولوں میں بھی آج کل سب سے پہلے قومی ترانہ "پاک سرزمین شاد باد" پڑھایا جاتا ہے۔ نہ خدا کی حمد و ثنا، نہ رسول کی نعت و توصیف نہ اسلام کا ذکرِ خیر، سرزمین کے گن گائے جاتے ہیں۔

کی طاقت ور خوراک نوخیز نسلوں کے سادہ ذہنوں میں اُتار دی جاتی ہے۔ اس طرح آغازِ عمر ہی سے ان کے سوچنے کے انداز قوم پرستانہ رُخ اختیار کر لیتے ہیں۔ قوم پرستی کے نام پر تنگ نظری اور خود غرضی کا سبق ان کو سکھایا جاتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے رنگین چشموں سے دیکھنے کے عادی بن جاتے ہیں۔ وحدتِ انسانیت اور مساواتِ آدم کا سبق ان معصوم بچوں کو پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ مغربی تعلیم ہر فرد کی آنکھ پر قوم پرستی کی عینکیں چڑھا دیتی ہے۔ جو کسی وقت اور کسی حال میں اُترتیں ہی نہیں۔ آج آپ کو ہر جگہ جرمن، انگریز، امریکن، روسی وغیرہ تو نظر آتے ہیں، لیکن انسان نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ قومی اور وطنی نقطۂ نظر تو عام ہے، لیکن آفاقی اور عالمگیر نقطۂ نظر مفقود ہے۔ کوئی جرأت مند روسو آج پیدا نہیں ہوتا جو مغربی بت کدہ میں اعلان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے تو صرف انسان پیدا کیے تھے، تم نے انگریز، جرمن، روسی، امریکن وغیرہ کہاں سے پیدا کر لیے؟

یورپ کو مسیحیت نے وحدتِ انسان کے عقیدہ کے ساتھ ایک جامع اخلاقی نظام دے رکھا تھا، جس میں خیر و شر، حق و باطل کا ایک معروف معیار موجود تھا۔ اس کی وجہ سے سارے عالمِ مسیحیت میں وحدتِ فکر و عمل قائم تھی۔ سب سے پہلے اس کے خلاف لوتھر نے بغاوت کی۔ پھر روسو اور دیگر قوم پرستوں نے اس وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس کے بعد کوئی عالمگیر اخلاقی نظام باقی نہیں رہا۔ اس کی جگہ متعدد اور مختلف النوع قومی نظام پیدا ہو گئے۔ وحدت کی جگہ غیر مربوط اور منتشر کثرت نے لے لی۔ انسانیت کی اکائی اقوام کی کثرت میں بٹ گئی۔ ہر علاقہ کے انسانوں کو ایک جداگانہ سیاسی اکائی تصور کر لیا گیا۔ اب عالمگیر اخلاقی اقدار کی بجائے قومی اغراض کی بالادستی قائم ہو گئی، جس کے بعد

تصادم اور پیکار ناگزیر بن گیا۔

آگے چل کر یورپ کو اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ انسانوں کو ایک وحدت کے تحت جمع کیے بغیر چارہ نہیں۔ کہیں تو ثقافت کے نام پر، کہیں باہمی مفادات کے نام پر اقوام کو خود ساختہ رشتوں میں منسلک کیا جا رہا ہے۔ کہیں لیگ آف نیشنز اور کہیں اقوامِ متحدہ کے ادارے وجود میں آ رہے ہیں۔ مگر یہاں یہ سوال اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا یہ خود ساختہ قوانین اور ضابطے مذہب کے رشتے کی جگہ لے سکیں گے؟ کیا یہ اغراض پرستی سے بلند ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ بے لاگ اخلاقی کردار ادا کر سکتے ہیں؟ کیا ان میں تقدّس و احترام پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو انسان کو خطاب کرنے کی بجائے ابھی تک اقوام کو خطاب کر رہے ہیں۔ اخلاق کی بجائے اغراض کے بندے بنے ہوئے ہیں ؎

مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام یا جمعیتِ آدم؟ (اقبال)

آج وہ لوگ اقوامِ متحدہ میں بیٹھ کر پیوندکاری اور بخیہ گری میں مصروف ہیں تاکہ ایک مصنوعی وحدت اور ایک مصنوعی عالمی نظام کی تخلیق اور تشکیل کریں، جنہوں نے کل انسانی وحدت کو قوم پرستی کے تیشہ سے پارہ پارہ کر ڈالا تھا، اب وہ لوگ اپنی غلطی کا ازالہ کر رہے ہیں۔

جیب و دامن کیوں کیے جوشِ جنوں میں تار تار
آج کیوں فکرِ رفو ہے کس لیے سوزن گری

۸۔ افادیت

مغربی فلسفی اور مفکرین نے انسانی زندگی کا مقصدِ اعلیٰ، محرکِ اعلیٰ اور غایت الغایات Summum Bonum متعین کرنے میں

بڑی مغز ماری کی ہے۔ لیکن حسبِ عادت وہ کسی ایک بات پر متفق نہیں ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ تنہا عقل کی مدد سے یہ منزل طے کبھی نہیں ہو سکتی۔ یہاں عقل سے بالاتر ذریعۂ علم درکار ہے۔ یہ وحی الٰہی کا میدان ہے۔ یہاں انبیاء کرام کی رہنمائی میں سفر طے ہو سکتا ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

گر بہ استدلال کار دیں بودے
فخر دیںؒ راز دار دیں بودے

ایک گروہ نے زندگی کا مقصد عیش و آرام اور لذت کوشی کو قرار دیا۔ Hedonism مگر یہاں مشکل یہ آن پڑی کہ لذت کسی فعل کے تابع بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے جو کامیابی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ مقصودِ جد و جہد اور ہدفِ سرگرمی بننے کی صلاحیت اس میں نہیں ہے۔ کھیل میں محنت اور مشقت کرنے سے کامیابی حاصل ہوتی ہے، جس کے نتیجہ میں خوشی، مسرت اور شادمانی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر خود مسرت کو مرکزِ نظر بنا لیا جاتا ہے تو پھر آدمی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ نتیجتاً محنت نہ ہو گی تو پھر کامیابی بھی نہیں ہو گی۔ اس طرح وہ مسرت و شادمانی سے محروم رہ جائے گا۔

دوسرے گروہ کی تشخیص یہ ہے کہ نیکی بذاتِ خود مقصود ہے۔ نیکی سے ارفع اور اعلیٰ اور کوئی مقصود نہیں ہے۔ مگر تصوری فلاسفہ Idealist Philosopher کی یہ باتیں مادہ پرست مغرب کو کب پسند آ سکتی تھیں۔

تیسرے گروہ نے کہا ہر وہ شے خیر ہے جو نافع اور مفید ہو اور ہر وہ شے

ل امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ المتوفی ۶۰۶ھ۔ شہاب الدین غوری کے ساتھ یہ پاکستان آئے تھے۔ یہ بہت بڑے فلسفی تھے۔

شر ہے جو مضر اور نقصان دہ ہو۔ یہ مادی معیارِ خیر و شر افادیت Utilitarianism کہلاتا ہے۔ یہ تصور مغرب کے مادی ذہن سے زیادہ قریب تھا۔ مغرب نے اس کو آسانی سے قبول کر لیا۔ انسان کو حیوان قرار دے کر، اُخروی زندگی کا انکار کرنے کے بعد، زندگی کا یہی مقصود ان کے نظامِ فکر سے ہم آہنگ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ اب مادی فوائد کے خواہاں ہیں اور بے لوثی اور اُخروی اجر و ثواب سے قطعاً نابلد۔ ؎

جو قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

تحلیلِ نفسی Psycho-Analysis کی کسوٹی میں افادیت خود غرضی کی ہی ایک لطیف شکل ہے۔ بلاشبہ فرد کی زندگی میں خود غرضی کی بھی کسی قدر گنجائش ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی میں یہ جذبہ انتہائی مہلک ثابت ہوا۔ خود غرضی کی وجہ سے افراد باہم مربوط نہیں رہ سکتے۔ معاشرہ مستحکم نہیں بن سکتا، اور اقوام متحد نہیں رہ سکتیں۔ خود غرضی کی فطرت میں افتراق و تصادم پنہاں ہے ؏

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

خود غرضی انسان کی فطرت کا خاصہ ہے، لیکن یہ ہرگز کسی فلسفہ یا اخلاقی ضابطہ کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ برٹرنیڈ رسل اس کے متعلق لکھتا ہے:

"ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفہ افادیت کا مبلغ ہر وہ شخص بن سکتا ہے جو جسمانی آسائشوں کو ہی اصل اہمیت دیتا ہے۔ مفید کی نگاہ میں وہ شے ہے جس سے جسم کی خواہشات اور ضروریات پوری کی جا سکیں۔ اگر یہی اس کا مفہوم ہے اور وہ کوئی فلسفہ تشکیل کر رہا ہے تو افادیت کا مبلغ یقیناً

سخت غلطی پر ہے۔"[1]

زر قابلِ قدر

فلسفۂ افادیت نے زر پرستی کو فروغ دیا۔ آج مغربی دنیا کی سب سے اہم قدر زر پرستی ہے۔ اس کا اظہار عام طور پر اس قسم کے جملوں سے کیا جاتا ہے: "زر قابلِ قدر شے ہے" Money is Value اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جس شے سے مالی منفعت حاصل ہو وہ پسندیدہ اور مستحسن ہے، اور جس شے سے مالی منفعت حاصل نہ ہو، وہ فضول ہے اور بے کار ہے۔ گویا مال و دولت ہی بس ایسی قدر ہے جس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اخلاقی اور روحانی قدروں سے ظاہراً کوئی مالی منفعت حاصل نہیں ہوتی، اس لیے یہ کسی قدر و قیمت کی حامل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مغربی معاشرہ میں ایثار، قربانی، صلہ رحمی، بے لوثی جیسی اعلیٰ قدروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کوئی بیٹا اپنے بوڑھے ماں باپ کو اپنے گھر پر رکھنے کا روادار نہیں، اس لیے کہ فی الوقت ان سے کسی مالی منفعت کی توقع نہیں، وہاں یہ کام بلدیہ کا ہے کہ وہ دار الضعفاء Oldage House قائم کرے۔ جہاں ایسے بوڑھے مرد اور عورت کی رہائش اور خدمت کا انتظام ہو۔ وہ کسی بیوہ بہن یا رشتہ دار کی کفالت کے لیے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ وہ تو اپنی صلبی اولاد کو بھی ۱۸ سال کی عمر کے بعد مفت خوراک مہیا کرنے کا روادار نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر نے انسان کے اعلیٰ شریفانہ اخلاق پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔

دوسری طرف اس نظریہ نے ہر قسم کی بے غیرتی اور بے حیائی کو جائز

---

[1] On Education, by Bertrand Russel, page 20

قرار دے دیا ہے، بشرطیکہ اس سے مالی منفعت حاصل کی ہو۔ اگر کوئی لڑکی جسم فروشی کر کے دولت کماتی ہے تو یہ جائز ہے ——— اگر کوئی فوجی جنرل دولت کمانے کے لیے اہم فوجی راز دشمن ملک کو فروخت کر دے اور بیک وقت کثیر دولت کمالے تو اس کو معلوم نہیں کیوں غداری کا متہم قرار دیا جاتا ہے اور پھانسی دی جاتی ہے؛ ظاہر ہے وہ بھی اپنے طور پر دولت کما رہا ہے۔

زر پرستی جب مقصود بن گیا تو تجارت اور سرمایہ داری پر سے ہر قسم کی اخلاقی بندشیں ختم کر ڈالی گئیں۔ تجارت آزاد ہو گئی۔ سرمایہ داروں نے ہر ایسے کام میں روپیہ لگانا شروع کر دیا جس میں بیش از بیش منافع حاصل ہو۔ اپنے کاروبار کو مقبولِ عام بنانے کے لیے دلکش اور جاذبِ نظر اشتہارات جاری کیے گئے۔ عورت کی نسوانیت کی اشتہاروں کے ذریعہ تذلیل کی گئی۔ اس طرف سے بالکل صرفِ نظر کر دیا گیا کہ ایسی تجارت افراد اور معاشرہ کی جسمانی یا اخلاقی صحت کے لیے کتنی مضر ہے۔ سرمایہ داروں نے دوسروں کی تباہی سے اپنی جیب بھر لی۔ مثلاً امریکہ کے ایک پودے تمباکو کو مغربی اقوام نے مختلف جتن اختیار کر کے ساری دنیا میں مقبولِ عام بنا دیا۔ ساری دنیا کو اس نشہ کا عادی بنا دیا۔ اس طرح خوب دولت سمیٹی۔ اس کے مضرِ صحت اثرات سے چشم پوشی کر لی۔ یہ بہت سے امراض کو جنم دیتا ہے اور لاکھوں قیمتی جانیں اس کی وجہ سے ہر سال ضائع ہو جاتی ہیں۔ اب جب کہ تباہی گھر میں پہنچ گئی تو اس وبا کے پھیلانے والے اس کے خلاف دہائی دے رہے ہیں۔ سگریٹ کے ہر پیکٹ پر لکھا جاتا ہے کہ یہ زہر ہے۔ کبھی تجویز کیا جاتا ہے کہ سگریٹ کو دوا فروش فروخت کریں۔ اس کے لیے اجازت نامہ کی شرط ضروری ہونی چاہیے۔ اخلاق سے عاری تجارت کی یہ ایک مثال ہے۔ ورنہ آج ہر تجارت کا

تقریباً ایک جیسا حال ہے۔

زرپرستی نے تعلیم کا تعلق پیٹ سے اور نوکری سے جوڑ دیا۔ اب پیشِ نظر نہ تعمیرِ سیرت ہے، نہ تطہیرِ اخلاق ہے، نہ تزکیۂ نفس ہے، نہ اخلاقِ عالیہ کا حصول ہے اور نہ تقویٰ، طہارت اور پاکیزگی کا کسی کو خیال ہے۔ آج کا نوجوان اس لیے پڑھتا ہے کہ اس سے نوکری مل جاتی ہے۔ تاکہ وہ دولت کمائے اور پھر عیش اڑائے۔ بلاشبہ آج کی پیچیدہ تمدنی زندگی میں روزگار حاصل کرنے کا مسئلہ بھی خاصا دشوار ہے اور ضرور اس کے حصول کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن تعلیم کا مقصد ہی روزگار کا حصول تصور کر لینا پرلے درجے کی کوتاہ نظری ہے۔ اس سے لوگوں کے ذہن میں انسانی زندگی کا تصور مزدوری اور چاکری سے آگے نہیں بڑھا۔ وہ انسان کی رفعت و شرافت سے ناآشنا ہیں۔ حیاتِ اُخروی میں تو ان کا کوئی مقام ہوگا ہی نہیں، قوموں کی برادری میں اور تاریخ کے صفحات پر بھی ایسے مزدوروں اور چاکروں کا کوئی ذکر باقی نہیں رہتا۔ غلامی کرنا اور چاکری کرنا ان کا مقصد ہے ؎

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

مغرب میں مذہب، اخلاق اور آخرت کا انکار کر دینے کے بعد انسانی زندگانی کے لیے محرکِ عمل اب صرف اغراض اور مفادات کے تصورات رہ گئے ہیں۔ ہر فرد بشر اغراض کا بندہ بن چکا ہے۔ اغراض کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ اغراض پرستی میں تصادم اور تظلم کا ناقابلِ محو جذبہ پوشیدہ رہتا ہے۔ افراد کا افراد سے ٹکراؤ اس راہ میں مقدر ہو چکا ہے۔ اب عقل و دانش کا کام بس اس قدر رہ گیا ہے کہ وہ اغراض کے مابین راہ مفاہمت پیدا کر دے۔ حق اور ناحق کی تو بحث ہی نہیں۔ زبردست اور زیردست کا فلسفہ کارفرما ہے۔

افراد سے گزر کر قوموں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہر قوم اور ہر طبقہ اپنے مفاد اور اپنی اغراض کے پیچھے مستانہ وار دوڑ رہا ہے۔ اس دوڑ میں کمزور کا کچلا جانا لازمی امر ہے۔ جس پر نہ کسی کو افسوس ہے نہ ندامت۔ یہاں بھی اقوامِ متحدہ اور دوسرے عالمی اداروں کا کام بس اسی قدر ہے کہ اقوام کی اغراض پرستی کے مابین راہِ مفاہمت پیدا کی جائے، تصادم کو کسی طرح کم کیا جائے۔ یہاں بھی زبردست اقوام کے ساتھ طرزِ عمل مختلف ہوتا ہے۔

اگر دنیا میں حقیقی امن و سکون اور عدل و انصاف قائم کرنا ہے تو وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اغراض پرستی کو ترک کیا جائے اور حق پرستی کو بنیاد بنایا جائے۔ مگر حق پرستی پر عمل کرنا اور قائم رہنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مذہبی اقدار پر ایمان راسخ نہ ہو، دنیا میں حق پرستی صرف مذہب کے زیرِ سایہ قائم ہو سکتی ہے۔

۹۔ اخلاقی صفات

ایک بات جو بڑے زور شور کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ نظامِ تعلیم کے ذریعہ چند صفات مطلوبہ طالب علموں کے اندر پیدا کرنا چاہئیں تاکہ عملی زندگی میں وہ کام دیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کسی نظامِ حیات، کسی فلسفہ یا مذہب سے ان کا تعلق جوڑا جائے۔ بعض صفات بہرحال پسندیدہ ہیں۔ بس ان کو اختیار کرنا چاہیے۔ خاص طور پر جرأت و جسارت، محنت و مستقل مزاجی، اپج اور جدت وغیرہ۔ اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ ان صفات کا حامل شخص زندگی کے ہر میدان میں کامیاب اور بامراد رہے گا۔ بلاشبہ یہ صفات پسندیدہ ہیں۔ کسی معقول آدمی کو اس سے یارائے اختلاف نہیں ہے۔ مگر جو لوگ صرف اتنی سی بات کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں، ان کے متعلق گمان گزرتا ہے کہ شاید انھوں نے اخلاق کے

مسئلہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ شاید اخلاق کی اصل حقیقت تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ اخلاق دراصل نہ مسرت کا نام ہے نہ شادمانی کا، نہ نفع رسانی ہے نہ مطلب براری Expediency جس میں حسب دل خواہ تبدیلی کرلی جاتی ہے۔ جیسا کہ اہلِ مغرب کے بعض مفکرین کا خیال ہے۔ اخلاقی صفات موضوعی نہیں، معروضی ہیں، عارضی نہیں دائمی ہیں، وقتی نہیں، عالمگیر ہیں۔ ان کی جڑیں انسان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ انسان اغراض کے حصول کی خاطر ان پر عمل پیرا نہیں ہوتا، بلکہ بے غرضی اور بے لوثی کا جذبہ محرکِ عمل ہوتا ہے۔ ان کی خاطر انسان بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے، حتیٰ کہ جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ ان کی خاطر نقصان برداشت کر کے اور تکلیف اٹھا کر وہ راحت و شادمانی محسوس کرتا ہے، جس کا تصور کرنا بھی اغراض پرستوں کے لیے مشکل ہے۔ یہ اخلاقِ حسنہ ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے جب تک آدمی کا خدا کی ذات پر پختہ یقین نہ ہو۔ جب تک اعمال کی جزا و سزا کا پختہ یقین نہ ہو، جب تک آخرت میں حساب و کتاب پر پختہ یقین نہ ہو۔ مذہب اور ایمان کی زمین میں اخلاق کا پودا برگ و بار لاتا ہے۔ دوسری کوئی زمین اس کو راس نہیں آتی۔

مذہب اور اخلاق کے پورے نظام سے کاٹ کر چند صفات کو اپنانے کی کوشش کی جائے تو نتائج توقع کے مطابق نہیں پیدا ہوں گے۔ بالفرض کسی طرح سے یہ صفات پیدا کر لی جاتی ہیں تو ان صفات کے استعمال سے انسانیت کی صلاح و فلاح کی کیا ضمانت دی جاتی ہے؟ یہ ضروری نہیں ہے کہ تنہا ان صفات کی بدولت ایک انسانی معاشرہ خیر و فلاح سے بھر جائے گا۔ یہ صفات تو ایک ہتھیار کی مانند ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ صفات اور یہ ہتھیار حیوانیت اور شہوانیت کے

پرستاروں کے ہاتھ میں ہوں گے۔ یا انسانیت اور شرافت کے معتقدین کے ہاتھوں میں؟ وہ شخص ڈاکو ہوگا یا فوجی جنرل؟ وہ چنگیز ہوگا یا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ؟ آخرت کے یقین سے ذمہ دار بنائے بغیر، ضبطِ نفس کی تعلیم دیئے بغیر، خیر و شر کا مسئلہ حل کیے بغیر، یہ ہتھیار لوگوں کے ہاتھوں میں تھما دینا ہلاکت اور بربادی کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔

تاریخ میں اس کی بعض مثالیں موجود ہیں۔ قدیم یونان کی شہری ریاست اسپارٹا Sparta میں، پوپ کے ہاتھوں میں، جیسوئٹ Jesuit تحریک اور نازی جرمنی کے نظامِ تعلیم و تربیت میں مذکورہ بالا صفات کو پیدا کیا گیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان تینوں تربیت یافتہ گروہوں نے مظلوم انسانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں اور انسانیت کی کوئی خدمت انجام نہیں دی ہے۔

یہاں پر کسی کو یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیئے کہ اخلاق کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ نہیں اس کے برعکس پورے اخلاقی نظام کو اختیار کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ انسان کی بدقسمتی ہے کہ مادیت میں غلو کی وجہ سے اہلِ مغرب نے انسان کو صرف جسم قرار دیا، رُوح کا صاف انکار کر دیا، نفس کو ذہن Psyche کا ہم معنی سمجھ لیا۔ ذہن کا کام تعقل اور تفکر ہے، جس طرح جگر کا کام تولیدِ صفرا ہے۔ رُوح اور نفس سے تو یونہی چھٹکارا حاصل کر لیا گیا، ذہن کو جسم کا جزو قرار دے دیا گیا۔ اب اصل مقصود جسم ہو گیا، یعنی اس کی صحت مندی اور اس کی تنومندی۔ حالانکہ یہ حقیقت کا ناقص تصور ہے۔ انسان جسم اور رُوح دونوں کا مرکب ہے۔ رُوح اور نفس کا جداگانہ وجود ہے۔ جس طرح جسم کو امراض لاحق ہوتے ہیں اور جسم کی کارکردگی کو بُری طرح متاثر و مجروح کر دیتے ہیں، اسی طرح نفس کو بھی امراض لاحق ہوتے ہیں۔ وہ بھی انسان کی کارکردگی کو متاثر کر دیتے ہیں۔

اخلاقِ ذمیمہ ۔ حسد، بغض، کینہ، خود غرضی، خود پرستی، انانیت وغیرہ اخلاقی برائیاں ہیں اور اخلاقی امراض ہیں۔ اہلِ مغرب ان امراض کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، اس لیے ان کے علاج کی طرف سے بھی غافل ہیں۔ یہ امراض مغربی معاشرہ میں انسانوں کے باہمی تعلقات کو تباہ کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف صحت مند نفس کے اندر ایثار، تحمل، انکسار، شفقت بے غرضی کی اعلیٰ صفات ہوتی ہیں۔ یہ صفات اس شخص کی کارکردگی میں غیر معمولی اضافہ کا باعث بنتی ہیں۔ انسانوں کے مابین تعلقات میں حسنِ ظن اور اعتماد کی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔ اس لیے ایسا شخص دنیا میں کامیاب اور بامراد رہتا ہے۔

اخلاق کے سلسلے میں ایک اور اعتراض پیش کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے تصورِ اخلاق میں طمع (جنّت) اور جبر (دوزخ) کے دو عنصر پائے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ایک ناقص تصورِ اخلاق ہے کہ آدمی بغیر کسی لالچ یا خوف کے نیکی اختیار کرے۔ یہ سارا استدلال ایک مغالطہ پر مبنی ہے۔ ارتکابِ فعل کے وقت اگر فاعل پر جبر کیا جائے یا اس کو لالچ دیا جائے، تب ضرور وہ فعل ناقص قرار پائے گا۔ مذہب نے جنت اور دوزخ کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ صرف ترغیب و ترہیب ہے۔ اس ترغیب و ترہیب کا اس مادی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب آخرت کے معاملات ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی تصوّر میں کامیابی کی مسرت اور ناکامی کی اذیت کے تصوّرات فاعلی ذہن میں وجہ تحریک بنتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ مذہب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ ذرا ایک قدم آگے بڑھ کر کامیابی اور ناکامی کی مجسّم شکلیں انسانوں کے سامنے پیش کر دی ہیں۔ کسی بھی طرح اس کو جبر یا طمع نہیں قرار دیا جا سکتا۔ واضح رہے کہ مذہب چند فلسفیوں کے لیے ہی نہیں ہوتا ہے،

بلکہ جمہور انسانوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے مذہب معاملات کو خیالی فلسفیوں کے نقطہ نظر Idealistic & Utopian سے نہیں دیکھتا ہے، بلکہ وہ حقیقت پسند Realistic ہے، اور عوام الناس کی سطح پر اُتر کر بات کرتا ہے اور سمجھاتا ہے اور منواتا ہے۔

آٹھواں باب

مقاصدِ تعلیم

تعلیمی اقدار پر گفتگو کرنے کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ تعلیم کے مقاصد پر بھی گفتگو کی جائے۔ ہر دور میں فلاسفہ اور مفکرین کا ایک گروہ اس کی کد و کاوش میں مشغول رہا کہ تعلیم و تربیت کے مقاصد متعین کیے جائیں۔ ہر دور کے حکما نئی تعریف پیش کرتے ہیں یا نیا اندازِ بیان اور طرزِ ادا اختیار کرتے رہے ہیں۔ اگر ان تمام تعریفوں کو یک جا پیش کر دیا جائے تو مختلف ادوار میں انسانی فکر کی پرواز اور انسانی فہم کا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔ ذیل میں ہم ایسی ہی ایک کوشش پیش کر رہے ہیں:

۱۔ نشاۃِ جدیدہ Reformation Period

پندرھویں صدی عیسوی میں مندرجہ ذیل مقاصدِ تعلیم تسلیم کیے جاتے تھے:

۱۔ جسمانی تربیت ۲۔ شائستہ آداب ۳۔ تعمیرِ سیرت

۴۔ تربیت ذوقِ لطیف ۵۔ انسان اور کائنات کا علم

۲۔ تحریکِ اصلاحِ دین Renaissance Period

سولھویں صدی میں تعلیم کے مقاصد مندرجہ ذیل تسلیم کیے جاتے تھے:

۱۔ مذہبی زندگی ۲۔ خردمندانہ شہریت

۳۔ نئی روشنی کا دور Enlightenment Period

سترھویں صدی میں تعلیم کے مقاصد مندرجہ ذیل تسلیم کیے جاتے تھے:

۱۔ شخصیت کا نشوونما ۲۔ عام لیاقت

۳۔ مشاہدۂ حق ۴۔ علم اشیاء

۴۔ صنعتی انقلاب کا دور Industrial Period

اٹھارھویں صدی و انیسویں صدی میں مقاصدِ تعلیم:

۱۔ مسرت و شادمانی ۲۔ تسخیر کائنات ۳۔ سائنسی معلومات

۵۔ دورِ جدید Modern Age

بیسویں صدی میں مقاصدِ تعلیم یہ متعین کیے گئے ہیں:

الف۔ قریبی مقاصد: ۱۔ جسمانی صحت ۲۔ مفید معلومات متعلق انسان ۳۔ کردار ۴۔ عزت

ب۔ حقیقی مقاصد: ۱۔ فلاح عامہ ۲۔ مسرت ۳۔ افادیت ۴۔ حظ اندوزی

۶۔ امریکی کمیشن برائے ثانوی تعلیم کی تحقیق:

۱۔ خاندان کا لائق فرد بننا ۲۔ شہریت ۳۔ پیشہ

۴۔ دولت ۵۔ فراغت کا استعمال ۶۔ اخلاقی کردار

۷۔ بنیادی ضروری معلومات پر عبور

۷۔ برطانوی کمیشن برائے ثانوی تعلیم کی تحقیق

الف: قریبی مقاصد: ۱۔ قوتِ مشاہدہ ۲۔ قوتِ استدلال ۳۔ تندرستی ۴۔ انسانی غایات اور تحصیلات سے محبت ۵۔ دست و نگاہ کی تربیت

ب: حقیقی مقاصد: ۱۔ کردار کی قوت ۲۔ عقل کا نشوونما

۲۔ عملی زندگی کے لیے

۸۔ ہندوستانی کمیشن برائے جامعاتی تعلیم کی تحقیق

الف۔ قریبی مقاصد: ۱۔ جسم ذہن اور روح کا نشوونما
۲۔ عادل قیادت ۳۔ آزادانہ اظہارِ فکروخیال ۴۔ مواقع استفادہ کی یکسانیت ۵۔ قومی اور بین الاقوامی برادری سے تعلقات

ب۔ حقیقی مقاصد: ۱۔ آزادی ۲۔ مساوات
۳۔ اُخوت

اگر تھوڑی سی کاوش اور کی جائے تو یہ فہرست اور بھی طویل ہو سکتی ہے۔ اس فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مقاصدِ تعلیم متعین کرنے میں حکماء اور فلاسفہ نے کچھ ایسے ہی کردار کا مظاہرہ کیا ہے جو ایک نوخیز لڑکا ساحلِ سمندر پر کرتا ہے، جب وہ اپنی جھولی کو رنگ برنگ کے پتھروں سے بھر لیتا ہے۔ مقاصد کی فہرست میں اگر آپ کوئی اصول، کوئی منطق یا کوئی قرینہ اور ضابطہ تلاش کرنے کی کوشش فرمائیں گے تو آپ کی کوشش لاحاصل رہے گی۔ خدا اور آخرت سے رشتہ توڑ لینے کے بعد مغربی مفکرین کے پاس پسند اور ناپسند کا معیار انفرادی ذوق رہ گیا ہے، اور انفرادی ذوق کی پسند پر کوئی بندش نہیں۔ وہ لامحدود ہے۔

جان لاک John Lock نے بہت پہلے ۱۶۹۳ء میں تعلیم کا مقصد یہ مقرر کیا تھا: "صحت مند جسم اور توانا ذہن" A sound mind in a sound body آج بھی کتابوں میں یہ الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس تعریف سے کوئی واضح بات سمجھ میں

Islamic and Educational Studies, by M. M. Sharif, Lahore

نہیں آتی۔ جسم ہو یا ذہن، دونوں آلے ہیں، کام کرنے کے ذرائع ہیں۔ آلے بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتے۔ مطلوب و مقصود کوئی دوسری شے ہوتی ہے۔ یہی حال بیشتر تعریفوں کا ہے۔ یہ مقاصد لفظی ہیر پھیر سے زیادہ نہیں ہیں۔ ذیل میں چند ایک مقاصد کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

تعلیم برائے شہریت

زندگی کی غایت الغایات اور کائنات میں انسان کی حیثیت سے انکار کر کے مغربی مفکرین نے انسان کے متعلق حقیقی اور آفاقی نقطۂ نظر فراموش کر دیا۔ اب وہ انسان کو معاشرہ کے فرد ہونے کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس پر ہی فکر کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد ان کے نزدیک بہترین شہری بنانا ہے۔ اس کو معاشرہ کے نقطۂ نظر سے تربیت دی جاتی ہے۔ فرد کی اہمیت یہ ہے کہ وہ معاشرہ کا جزو ہے۔ وہ فرد کو اجتماعیت کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی وجود فرد کا ہے۔ معاشرہ کا وجود فرضی اور معنوی ہے۔ فرد نے تکمیلِ شخصیت اور تعمیرِ سیرت کے لیے معاشرہ کو تخلیق کیا ہے۔ اس لیے اصل اہمیت فرد کی ہے ایک حقیقی وجود کو ذہنی اور معنوی وجود پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ ان مفکرین کا حال اس عطار کے مشابہ ہے جو گلاب پر اس نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے کہ اس سے گلقند بہت اچھا بنتا ہے۔ اس کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ گل میں لطافت ہے۔ رعنائی ہے، رنگ و بو کی کشش ہے۔ یہ کوتاہ نظری انسانیت کے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔

تعلیم بذریعہ عمل

جدید دور کے ایک اہم مفکر کا خیال ہے کہ تعلیم کا مقصود پہلے سے متعین نہیں ہے، بلکہ عمل تعلیم

خودبخود مقصد کا تعین کر دیتا ہے۔ اصل اہمیت عمل تعلیم کی ہے۔ ڈیوی کے یہاں اصل شے کے مقابلہ میں اس کے سانچے اور قالب کی اہمیت فلسفۂ نتائجیت کا مطلب یہ ہے کہ فکر سے مقصود راہِ عمل ہے۔ اصل محرک راہِ عمل تلاش کرنا ہے۔ مقصد کی اہمیت کم، ذریعہ اور وسیلہ کی اہمیت زیادہ ہے۔[1] حالانکہ یہ بات مسلّم ہے کہ عمل کسی نہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ عمل تو ذریعہ ہوتا ہے۔ عمل سے مقصود کے تصوّر کو کیسے خارج کیا جاسکتا ہے؟ ڈیوی کے تصوّر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی جنرل کہے کہ سپاہی کا کام اسی قدر ہے کہ وہ ہتھیاروں کو استعمال کرتا رہے، دائیں بائیں ہر طرف خوب ہاتھ دکھائے اور اس بات سے قطعاً سروکار نہ رکھے کہ مشقِ شمشیر زنی کس غرض کے لیے ہو رہی ہے اور اس مشقِ ستم رانی کا ہدف کون بن رہا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ایک سفاک ڈاکو بھی اتنا ہی محترم بن جاتا ہے جتنا کہ ایک فوجی جنرل۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فسادِ فکر و نظر کی یہ ایک واضح مثال ہے۔

جب خلانوردی کے میدان میں (۱۹۵۷ء) روس، امریکہ پر سبقت لے گیا، تب لوگوں کو ڈیوی کے نظریۂ تعلیم کا کھوکھلا پن ظاہر ہو گیا۔ سب اس پر برس پڑے۔ اس وقت سے اس کے نظریہ کو رد کر دیا گیا ہے۔

تعلیم برائے ذخیرۂ معلومات

مذہب اور اخلاق سے رشتہ منقطع کر لینے کے بعد مغربی مفکرین

[1] مشہور امریکی فلسفی جان ڈیوی (۱۸۵۹ - ۱۹۵۲ء) کا فلسفۂ نتائجیت Pragmatism کے بانیوں میں سے شمار ہوتا ہے۔ ستاسی سال کی عمر میں اس نے ایک نوعمر لڑکی سے شادی رچائی تھی۔

کے یہاں تعلیم معلومات اندوزی کا ہم معنی قرار پا گئی۔ تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ معلومات کی ذخیرہ اندوزی کر لی جائے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔ نظریۂ معلومات اندوزی قبول کر لینے کے بعد مغربی نظامِ تعلیم میں لائبریری، لیباریٹری، امتحانات، سندات، دفتریت اور عمارات کو اصل اہمیت حاصل ہو گئی۔ ان کے اہتمام اور انصرام اور آسائش و زیبائش پر بے تحاشا دولت صرف کی جاتی ہے۔ حسنِ تعمیر اور حسنِ تزئین کا باہم مقابلہ ہوتا ہے۔ بے چارے اُستاد اور شاگرد جن کے نام پر یہ سارا ہنگامہ برپا ہے، وہ اس غوغا میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ احکام اور ضابطہ کی جکڑ بندی کا یہ عالم ہے کہ اُستاد اور شاگرد انتظامیہ کے تحت دو بے اثر پرزوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ درس گاہیں آج مفقود ہیں جہاں شفیق اُستاد اور اطاعت شعار طالبِ علم درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، جہاں باہمی تعاون سے کردار سازی اور انسان آفرینی کا عمل جاری رہتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درس گاہ نہیں ہے، کوئی کارخانہ ہے جہاں بے جان پرزے ڈھالے جا رہے ہیں۔

نظریۂ معلومات اندوزی میں تحقیق کے کام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ عام طور پر تحقیق کا انداز یہ ہوتا ہے کہ کوئی پچیس سالہ نوجوان تحقیق کا مدّعی بن کر سامنے آتا ہے۔ حالانکہ اس کو اظہارِ مدّعا پر واجبی سی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ فن کے اصول و مبادی کا بھی اس کو پوری طرح علم نہیں ہوتا۔ فن کے غوامض اور دقائق پر عبور حاصل کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ وہ نوجوان اپنے رہنما کی مرضی کے مطابق اس فن سے متعلق ذخیرۂ معلومات کو خاص نہج سے ترتیب دیتا ہے۔ اس طرح ایک تحقیقی مقالہ تیار ہو جاتا ہے۔ جامعہ اس کی قدر افزائی فرماتی ہے۔ اس کو ڈاکٹر (علّامہ) ہونے کی سندِ افتخار عطا کرکے اقران و اماثل میں ممتاز

بنادیتی ہے۔ ساری زندگی یہ الگوتا نامہ تحقیق علامہ کی زرخیزی ذہن کا زبانِ حال سے اعلان کرتا رہتا ہے۔

معلومات کا تعلق انسان کے ماحول سے اور مادّی کائنات سے ہے۔ اس لیے اس میدان میں تحقیق اور جستجو کی بدولت روزانہ نئے نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں قدیم کے مقابلے میں جدید کی اہمیت زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے آئے دن کتبِ نصاب تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ نئی کتب تصنیف کی جاتی ہیں۔ انسان ایک خاص حد تک ہی معلومات کو ہضم کر سکتا ہے۔ اس لیے لازمی اور اختیاری مضامین کی تقسیم کی گئی۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہر مضمون کی اہمیت یکساں ہے، خواہ اس کا تعلق چیونٹی کے پر کی حرکات گننے سے ہو یا انسان کی نفسیات اور عمرانیات سے ہو۔

مغربی مصنفین کے اندازے کے مطابق ۱۷۷۴ء تک جو ذخیرۂ معلومات انسان کے پاس جمع ہو گیا تھا، ۱۹۰۰ء میں وہ دوگنا ہو گیا اور اب ۱۹۷۵ء تک چوگنا ہو گیا ہے۔ ۲۰۰۰ء تک پہنچتے پہنچتے شاید آٹھ گنا ہو جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ سارا ذخیرہ کسی ایک کھوپڑی میں جمع ہو جانا عملاً ناممکن ہے۔

بہرکیف کل تک ذخیرۂ معلومات جمع کر لینے سے روزگار کا مل جانا یقینی امر تھا، لیکن اب وہ حالات باقی نہیں رہے؎۔ معاشرتی علوم

ل نظریۂ معلومات کے تحت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ، اعلیٰ مناصب پر فائز ہو کر بعض دفعہ ایسی بداخلاقی اور بدکرداری کے مرتکب ہوتے ہیں کہ عوام حیرت سے دریافت کرنے لگتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر بھی یہ لوگ انسان نہیں بنتے، اس لیے کہ عوام کے ذہن میں تعلیم کا گہرا تعلق اخلاق سے ہے۔ اب ان لوگوں کی کمزوری یہ ہے کہ جو تعلیم انہوں نے حاصل کی ہے اس کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلی جماعت سے

کی اہمیت تو مدّت ہوئی ختم ہو چکی تھی، Liberal Sciences اب فنی اور سائنسی علوم کی بھی ناقدری ہو رہی ہے۔ کافی تعداد میں فنی ماہرین بے روزگار پھر رہے ہیں۔ اور کہیں روزگار نہیں ملتا۔ ایسی صورتِ حال نے امریکہ کے چند مفکرین کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا معلومات کی ذخیرہ اندوزی اب بھی مفید ہے؟ ان کے سوچنے کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ جتنی رقم تعلیم کے دوران ایک طالبِ علم پر صرف کی جاتی ہے، کیوں نہ وہ رقم طالبِ علم مذکور کو آغاز میں ہی دے دی جائے تاکہ وہ سود مند کاروبار میں لگا دے۔ تجارت بڑی حد تک روزگار کا یقینی ذریعہ ہے؎۔

تعلیم برائے پیداواری

معاشرہ میں انسان کی حیثیت مغربی مفکرین نے ایک معاشی عامل اور ایک عمرانی عامل کی مقرر کی ہے۔ وہ معاشرہ کی دولتِ مشترکہ میں اضافہ کا باعث ہے۔ وہ عمرانی اداروں کی کارکردگی میں مفید خدمات انجام دیتا ہے۔ وہ ایک کارکن ہے، ایک عامل ہے؛ اس لیے مغربی نظامِ تعلیم کا سارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ انسان کو بہترین معاشی عامل اور عمرانی کارکن کی حیثیت سے تربیت دی جائے، تاکہ معاشرہ کو بہترین کارکن فراہم ہوں۔ سارا نظامِ تعلیم اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ انسان بحیثیت انسان کسی قدر و احترام کا مستحق نہیں ہے۔ اس کی انفرادیت کو اجتماعیت کی نذر کر دیا

لے کر بی۔اے اور ایم۔اے تک کسی نصابی کتاب میں یہ درج نہیں ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے، چوری گناہ ہے۔ بداخلاقی گناہ ہے۔ یہ بے چارے اخلاقی اعتبار سے کورے رہ جاتے ہیں۔ ساری خرابی ناقص تعلیم کی ہے۔

ؔ Time Weekly America, Issue 12th April 1973
Education, by William Arwin Thomson

گیا ہے۔ اس لیے فرد روز بروز نحیف و لاغر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا اخلاقی انحطاط روز بروز بڑھ رہا ہے۔ آخر یہ لاغر گھوڑا کب تک معاشرہ کی گاڑی کھینچتا رہے گا؟

مغربی نظامِ تعلیم کو انسانیت کے اعلیٰ نمونوں اور اخلاقی بلندیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تعلیم کا سارا زور معاشی اور تمدنی عوامل پیدا کرنے اور پروان چڑھانے پر ہے۔ یہ ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، فنی ماہرین، صناع، کاریگر، تاجر، رقاص، فن کار وغیرہ معاشی اور تمدنی عامل ہی تو ہیں۔ بدقسمتی سے اس سارے ڈرامے میں اصلی انسان اوجھل بلکہ مفقود الخبر ہو گیا ہے۔ یہ انجینئر اور یہ ڈاکٹر تو اصلی انسان کے چند پرتو ہیں، اصلی انسان کے چند مظاہر ہیں۔ یہ مظاہرات عارضی ہیں، انسان باقی ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ کا دائرۂ عمل محدود ہے، وقتی اور ہنگامی ہے لیکن انسان ہمہ وقت اور ہمہ جہت انسان رہتا ہے۔ انجینئرنگ اور ڈاکٹری کے محدود سے دائرہ کے باہر بھی وہ انسان ہے۔ اور خود ان دائروں کے اندر بھی اس کا واسطہ ہر وقت انسانوں سے پڑتا ہے۔ اس لیے تعلیم کا اصلی اور حقیقی مقصد انسان کو پہلے انسان بنانا ہے۔

نہایت ضروری ہے کہ ہر انسان کے سامنے بطور مطمحِ نظر شرافت و اخلاق کا ایک اعلیٰ معیار ہو۔ انسان کے اندر چند صفاتِ محمودہ خوش خلقی، ہمدردی، تعاون، للّٰہیت پیدا کی جائیں۔ اور چند صفاتِ مذمومہ مثلاً: خود غرضی، ہوس پرستی، کج خلقی، رعونت وغیرہ سے اس کے دل و دماغ کو پاک و صاف کیا جائے۔ بہترین نظامِ تعلیم وہ ہے جو پہلے انسان کو انسان بنائے، پھر ان کو ڈاکٹر، انجینئر، تاجر، سول سرونٹ یا فوجی جنرل بنائے۔ افسوس مغربی نظامِ تعلیم اس حقیقت سے بیگانہ ہے۔ مغربی

تعلیم نے بچپن میں جو ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی عینک آنکھوں پر چڑھا دی ہے وہ انجینئرنگ اور ڈاکٹری کے کارناموں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے۔ لیکن اس کے پسِ پردہ جو انسانیت رو رہی ہے، اور تڑپ رہی ہے، اور رقصِ بسمل کر رہی ہے، وہ سب کچھ اس عینک سے نظر نہیں آتا۔ اس کا کوئی احساس ہی نہیں۔ بقول جگر مرادآبادی ؎

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

تعلیم برائے انسانیت

تعلیم برائے روزگار در حقیقت کوئی تعلیم ہی نہیں ہے۔ یہ کاردانی ہے کارآموزی ہے۔ یہ حقیقت اب بعض مغربی مفکرین پر بھی واضح ہوتی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

"میں تعلیم برائے کردار اور تعلیم برائے معلومات میں تمیز کرتا ہوں"

مذہبی تعلیم کے بغیر چارہ نہیں۔ حقیقی تعلیم یہ ہے کہ مذہبی عقائد پر ایمان راسخ پیدا کیا جائے، جن پر انسانی زندگی کا جہاز لنگر انداز ہوتا ہے۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ کسی طریقہ سے بھی انسانی عظمت کا تصور دل میں جاگزیں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شعور نہ ہو تو پھر کوئی شے انسان کو حیوان کی سطح پر گرنے سے نہیں روک سکتی ہے۔ آخرت پر ایمان انسان کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے، جس کو کسی اور طریقہ سے نہیں پیدا کیا جا سکتا۔

مذہبی اصولوں پر انسان کا کردار استوار کرنا ضروری ہے، تاکہ ان میں استحکام اور دوام پیدا ہو۔ اس کو ضبطِ نفس کا عادی بنانا ضروری

ہے۔ معاشرہ میں بس وہ مذہبی تعلیمی اصول ہی کامیاب رہتے ہیں جن کی سیرابی مذہب کے سرچشمہ سے ہوتی ہے۔ حقیقی تعلیم انسان کو فکری رُخ اور ذہن کو ایک سانچہ مہیا کرتی ہے۔ حقیقی تعلیم تطہیرِ افکار، تعمیرِ کردار اور اخلاقِ حسنہ سے عبارت ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی ہو، اس کو بہرکیف بنیادی انسانی تعلیم کی ضرورت مقدم ہے۔ پہلے اس کو نظریۂ حیات، اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ کی تعلیم دینا نہایت ضروری ہے۔ پہلے اس کو ایک بہتر، بلکہ ایک شریف انسان بنانا ضروری ہے۔ یہ شریف انسان جہاں کہیں بھی جائے گا اور جس کام میں بھی ہاتھ ڈالے گا، اس میں چار چاند لگا دے گا۔ دوسرے مرحلہ پر فنی اور سائنسی تعلیم دے کر معاشی عامل بنایا جائے۔ پھر اس کو عمرانی کارکن بنایا جائے۔ اب وہ معاشرہ کی خدمت بہترین طریقہ پر انجام دے گا۔ اب اس کا وجود معاشرہ کے لیے خیر کا باعث بن جائے گا۔

برخلاف اس کے اگر انسان کی انسانیت کو یکسر نظر انداز کرکے صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر اکتفا کرلیا گیا تو اس کی بنیاد میں کمزوری رہ جائے گی۔ وہ بحیثیتِ انسان بودا اور ناکارہ ہوگا۔ گویا عمارت تو کہنہ اور بوسیدہ ہو رہی ہو، لیکن اس میں فرش، پردے اور صوفے بڑے قیمتی بچھائے جا رہے ہوں۔ عمارت کی کہنگی کا بدل قیمتی صوفے نہیں بن سکتے۔ جب عمارت گرے گی تو یہ قیمتی سامان بھی ضائع ہو جائے گا۔ افسوس مغربی تعلیم جوہری انسان میں اور اس کے عارضی مظاہرات میں تمیز کرنے میں بالکل ناکام رہی ہے۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف (اقبال)

نواں باب

دَورِ جدید اسلام کی بَرکت ہے

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مذہب کی تعلیمات سائنس کی تحقیقات کے خلاف ہیں۔ وہ لوگ اس عموم میں مذہبِ اسلام کو بھی شامل کرلیتے ہیں۔ فرانس کے مشہور فلسفی ارنسٹ رینان Earnest Renan, 1823-1892 نے گذشتہ صدی کے اواخر میں اسلام کے خلاف ایسی ہی تنقید کی تھی۔ حُسنِ اتفاق سے اس زمانہ میں ترجمانِ اسلام سیّد جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء تا ۱۸۹۸ء) پیرس میں مقیم تھے۔ یہ تنقید پڑھ کر وہ رینان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے لیے اس کے پاس گئے۔ گفتگو کے بعد رینان نے نہ صرف اسلام کے متعلق اپنی غلط فہمی کا اعتراف کیا، بلکہ شیخ کی عظمت کا بھی اعتراف کیا۔

سائنسی نقطۂ نظر قرآن کا عطیہ

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ سائنسی نقطۂ نظر سے دنیا کو اسلام نے روشناس کرایا ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کے پاس جو طبعی معلومات تھیں، اُن میں رطب و یابس شامل تھا۔ خرافات اور دیوتاؤں کے کرشمے شامل تھے۔ کافرانہ، مشرکانہ یا نیم مشرکانہ تہذیبوں کے لیے خالص سائنسی اصولِ تحقیق کا دریافت کرلینا ممکن ہی نہیں تھا۔ ان کے عقیدہ کے مطابق ہر کام کا ایک دیوتا مقرر تھا۔ اس

لیے طبعی عوامل کی جانب ان کی توجہ جا ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ دریافت خالص موحدانہ تہذیب کا کارنامہ ہے۔ وہاں وحدتِ خالق پر پختہ ایمان ہوتا ہے۔ وحدتِ خالق کے عقیدہ سے منطقی طور پر ایک طرف وحدتِ مخلوق کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف وحدتِ خالق سے سنت اللہ یعنی قانونِ طبعی کی ابدیت Eternity اور آفاقیت Universality کا اعتقاد پیدا ہوتا ہے۔ یہ صرف منطقی استخراج نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید نے اس امر کا صاف اعلان کیا ہے:

وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (بنی اسرائیل)

"اللہ کی سنت (قانون) میں تم ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔"

یہی وہ دو بنیادیں ہیں جن پر سائنس کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ یہ بنیادیں توحید پرست مذہب ہی فراہم کر سکتا تھا۔ اسلام کی موحدانہ تہذیب سائنس کی موجد ہے۔ مصر، بابل، یونان، اور روما کی مشرکانہ تہذیبیں ہرگز سائنس کی موجد نہیں ہیں۔[1]

اسلام نے نہ صرف آفاقیت قانون کا عقیدہ دیا ہے، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر سب سے پہلے علم صحیح کی حدود انسان کو سمجھائی ہیں۔ قرآن فرماتا ہے:

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا

(بنی اسرائیل)

---

[1] یونانی تجربات کی دنیا سے بیگانہ تھے۔ ارسطو دو بیویوں کا شوہر ہونے کے باوجود لکھتا ہے کہ مرد کے منہ میں ۳۲ اور عورت کے منہ میں ۲۸ دانت ہوتے ہیں۔ تجربہ کی دنیا سے وہ کتنا بیگانہ تھا؛ علوم کی تحقیق کے سلسلے میں تجربات پر اعتماد کرنا عربوں نے دنیا کو سکھایا ہے۔

"یعنی جس بات کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے مت پڑو، کان، آنکھ، دل، سب کو جواب دہی کرنی ہوگی۔"

یہ آیت بتاتی ہے کہ علم صحیح آنکھ، ناک، کان یعنی حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، جس پر دِل مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے۔ حواس اور غور وخوض علمِ صحیح کے ضروری مراتب ہیں۔ مزید بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب تک علم صحیح نہ ہو، اس وقت تک اٹکل پچو بات نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ ذمہ داری کا احساس، غور وخوض کا ملکہ اور حقیقت رسی کا جذبہ ہی وہ اسلامی تعلیمات ہیں جنھوں نے سائنس کے لیے بنیاد فراہم کی۔ دوسری طرف قرآن مجید میں سینکڑوں آیات موجود ہیں جن میں مظاہرِ فطرت پر انسانوں کو غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دونوں باتیں، یعنی علم صحیح کا معیار مقرر کرنا اور فطرت پر غور وفکر کی دعوت دینا، گویا بالواسطہ طور پر انسانوں کے ذہن کو مطالعۂ فطرت کی طرف مائل کرنا تھا۔ چنانچہ اوائلِ اسلام میں ہی مشاہداتِ فطرت سے متعلق لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔ بُرا ہو یونانی فلسفہ کا کہ جس نے داخل ہو کر مسلمانوں کا رُخ حقائق کی دنیا سے موڑ کر تصورات کی دنیا کی طرف پھیر دیا۔ اس طرح سائنسی علوم کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ پانچ صدی گزر جانے کے بعد مسلمان یونانی افسوں کے سحر سے آزاد ہوئے۔ اور پھر وہ تجربات کی دنیا میں آئے۔ مگر افسوس اب ان کا دورِ عروج رُو بہ زوال ہو چکا تھا۔

اُندلس کے حکماء اہلِ علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جدید مغربی دنیا میں قصرِ سائنس کی بنیاد اُندلس کے حکماء کے ہاتھوں رکھی گئی ہے۔ لیکن جلدی ہی اُندلس پر زوال کے بادل چھا گئے، اور مغربی مفکرین کے ہاتھوں میں یہ بچہ پل کر جوان ہوا۔ آغاز سے مسلمان علماء کے

دو گروہ تھے: مشرقی یعنی ایران و عرب کے حکماء اور مغربی یعنی اندلس اور مراکش کے حکماء۔ مشرقی حکماء کا رجحانِ طبع تصوری نظام قائم کرنے کی جانب تھا۔ گویا وہ جرمن فلاسفہ سے مشابہہ تھے۔ مغربی حکماء واقعیت پسندانہ رجحان رکھتے تھے۔ انھوں نے حقائقِ اشیاء اور حقائقِ معاشرہ پر غور کیا۔ گویا وہ انگریز فلاسفہ سے مشابہہ تھے۔

سائنسی ایجادات کی جانب اندلس کے ایک حکیم عباس ابن فرناس (۸۸۸ء) نے اہم اقدام کیا تھا اس نے اپنے کمرہ میں نظام شمسی کی شبیہ تعمیر کی تھی جس کے بعد وہ کمرہ کے اندر بیٹھ کر ہی ستاروں کی گردش کا مطالعہ کرتا ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے اس نے پر لگا کر آسمان میں پرواز کی کوشش کی تھی۔

ابن حزم اندلسی (۹۹۴ء تا ۱۰۶۴ء) فقیہہ ہونے کے علاوہ فلسفی بھی تھا۔ اس نے سب سے پہلے یہ نظریہ تشکیل دیا تھا کہ علم صحیح کی بنیاد حواسِ صحیح پر قائم ہے۔ وہ کانٹ کا پیش رو تھا۔ اس نے سات سو سال قبل محسوسات کو عقل کی اساس بنایا تھا۔ ابن طفیل (تا ۱۱۸۵ء) نے حی بن یقظان لکھ کر تعقل اور تفکر کی قوتوں کی بالادستی اور کارفرمائی کا بڑی وضاحت سے اظہار کیا تھا۔ اس نے ثابت کیا کہ علوم حکمت تہذیب و تمدن سب انسان نے غور و فکر اور عقل کی مدد سے ایجاد کیے ہیں۔ سارے انسانی علوم وضعی ہیں۔ امام غزالیؒ (۱۰۵۵ء تا ۱۱۱۱ء) نے تہافتہ الفلاسفہ لکھ کر بروقت عقل کی کمزوری اور محدودیت کا اظہار کیا۔ قاضی ابو الولید ابن رشید (۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء) نے تہافتہ التہافتہ لکھ کر پھر عقل کی

ل De Foe کی کتاب Robinson Cruso (۱۷۱۹ء) حی بن یقظان سے ماخوذ ہے۔
(تاریخ عرب از فلپ حتی ص ۵۹۶)

بالادستی بحال کر دی۔ عقل پرستی کا صور اس نے بہت زور سے پھونکا تھا، جس کی صدا مغرب میں بھی گونجتی رہی۔ ابن رشد Averrose نے مغربی مفکرین اور مغربی فکر پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کے متبعین یہودی اور عیسائی فلاسفہ "رشدی" کہلاتے تھے۔ ان رشدی فلاسفہ نے مغرب میں تفکر کو بیدار کیا۔ ابن خلدون نے انسانی تمدن کے ارتقار اور اس کے عروج و زوال کے قوانین کو پہلی مرتبہ مدلل طریقہ سے پیش کیا۔

اندلس کے مسلمان حکماء کا سب سے عظیم الشان، سائنس استقرائی طریقہ Inductive Method ہے۔ جس نے سائنس کی تحقیقات کے لیے راستہ کھول دیا۔ ابھی وہ ان بنیادوں پر مزید کام کر رہے تھے کہ عیسائی یلغار نے اندلس کی اسلامی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سارے تہذیب و تمدن کو تلپٹ کر دیا۔ کتابوں کو جلا ڈالا۔ اہلِ مغرب نے جذبۂ تعصب کے تحت اس ایجاد کو روجر بیکن Roger Bacon, 1214-1294 سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ روجر بیکن نے عربی کی تحصیل اندلس میں جا کر کی تھی۔ وہاں سے ہی یہ طریقے اخذ کیے تھے۔ امریکی مصنف ڈریپر لکھتا ہے:-

"مجھے اس بات پر بے حد افسوس ہے کہ یورپ کے مصنفین نے بڑی باقاعدگی کے ساتھ دیدہ و دانستہ مسلمانوں کے اس احسان کو چھپانے کی کوشش کی ہے جو یورپ والوں کی گردن پر ہے۔ عربی علوم کی ان نشانیوں سے جواب تک باقی رہ گئی ہیں، ہمیں مسلمانوں کے عروج ذہنی کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ ان کی بہت سی کتابیں فنا ہو چکی ہیں اور بہت سی قصداً

فنا کر دی گئی ہیں۔"

بریفالٹ لکھتا ہے :-

"سائنس سے تحقیق کی نئی رُوح، تفتیش کے نئے طریقے، پیمائش اور مشاہدہ کے لیے نئے اسلوب مراد ہیں۔ جن سے یونانی بےخبر تھے۔ یورپ میں اس رُوح اور ان اسالیب کو رواج دینے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔[۲]"

مزید لکھتا ہے :-

"سائنس عربوں کا سب سے عظیم الشان عطیہ ہے عہدِ جدید کے لیے۔ اگرچہ اس کو پھل لانے میں کافی دیر لگی۔ جب عرب تہذیب کی شمع اندلس میں بجھ کر خاموش ہو گئی۔ تب یہ دیو اُٹھ کھڑا ہوا جس کو اُنھوں نے پیدا کیا تھا۔[۳]"

پندرھویں صدی عیسوی تک یورپ کے اندر ایک بھی ایسا مصنف نہیں تھا جو عربوں کا خوشہ چیں نہ ہو۔ راجر بیکن، سینٹ طامس St. Thomas, 1227-1274 البرٹ دی گریٹ Albert the Great الفانسو Alphonso, 1252-1284 یا تو عربوں کے شاگرد تھے یا ناقل تھے۔ البرٹ کا فلسفہ ابن سینا سے ماخوذ ہے اور سینٹ طامس نے ابن رشد سے افکار حاصل کیے ہیں۔[۴] کوپرنیکس Copernicus, 1473-1543 نے اپنی انقلاب انگیز کتاب "اجرام سماوی کی حرکت" میں ابن رشد کی فکری عظمت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔[۵] ان وجوہ

---

[۱] معرکہ مذہب و سائنس از ڈریپر، اُردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان۔

[۲] تشکیل انسانیت از رابرٹ بریفالٹ ترجمہ عبدالمجید سالک ص ۲۰۲ و ص ۲۰۲

[۳] تشکیل انسانیت از رابرٹ ریفالٹ ترجمہ عبدالمجید سالک ص ۲۰۲ و ص ۲۰۲

[۴] تمدن عرب از گستاؤ لیبان [۵] میراث اسلام ص ۲۰۶

کی بنا پر وکٹر ہیوگو Victor Hugo, 1802-1885 کو برملا یہ اعتراف کرنا پڑا تھا "پہلے دنیا یونانی تھی اور اب عربی ہے۔"[۱]

بعض لوگ موجودہ سائنس کے لادینی مزاج کو سامنے رکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنس اسلام کے خلاف ہے۔ یہ ان کا سرسری اندازہ ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دنیا میں حقائق Facts غیر جانب دار رہتے ہیں۔ ہر قوم اپنے ذہنی پس منظر میں ان حقائق کو ترتیب دیتی ہے۔ یونانیوں نے اپنا دیوِ مالائی مشرکانہ پس منظر دے رکھا تھا۔ عربوں نے اسے سنت اللہ کا منظر دیا۔ آج کے مسلمان دوبارہ اس کو حق پرستی کا پس منظر عطا کر سکتے ہیں۔ تعمیری مسالہ اینٹ گارا ہو یا سیمنٹ لوہا، غیر جانب دار ہوتا ہے۔ ھندو اس سے ایک خاص طرز کی عمارت — مندر — تعمیر کرتا ہے۔ عیسائی اس سے خاص قسم کی عمارت — گرجا — تعمیر کرتا ہے۔ مسلمان مخصوص طرز کی عمارت مسجد — تعمیر کرتا ہے۔ مسالہ ایک ہونے کے باوجود تعمیر کنندہ کی ذہنیت نے عمارت کو خاص شکل، خاص طرز اور مخصوص نوعیت عطا کر دی ہے۔ اب اگر کوئی شخص بضد ہے کہ اس مسالہ سے صرف گرجا تعمیر ہو سکتا ہے تو وہ بے جا ہٹ دھرمی کا شکار ہے۔ اور اگر دوسرا شخص اس بات پر ایمان لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ واقعی اس سے گرجا ہی بن سکتا ہے تو یہ کسی افسوں زدہ شخص کا ہذیان ہو سکتا ہے، صحیح العقل لوگوں کا فتویٰ نہیں ہو سکتا۔ سائنس کا مورخ پروفیسر سارٹن شہادت دیتا ہے کہ :-

"قرونِ وسطیٰ میں (جب سائنس کے میدان میں صرف مسلمان پیش پیش تھے) یہ نقطۂ نظر عام تھا کہ مذہب کی عقلی توجیہہ نہ صرف سائنس کی بنیاد ہے بلکہ مذہب کے لیے قوت بھی ہے۔

---

[۱] یورپ پر عربوں کے احسانات

لہذا مذہب اور سائنس ناقابلِ تفریق ہیں۔[1]

عقلیت پرستی کا جدید دَور

نہ صرف سائنسی تحقیقات بلکہ عقلیت پسندی بھی اسلام کا تحفہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدیم اور جدید دَور کے سنگم پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں تک ذریعہ علم یعنی وحی الٰہی کا تعلق ہے۔ وہ قدیم دنیا سے متعلق نظر آتے ہیں۔ لیکن جہاں تک علومِ وحی کا تعلق ہے وہ جدید دُنیا سے متعلق نظر آتے ہیں۔ اس دعویٰ کی حقیقت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے قلم سے سُنیے۔ سیرت الرسولؐ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"صحرائے عرب کا یہ اَن پڑھ بادیہ نشین جو چودہ سو برس پہلے اس "تاریک دور" میں پیدا ہوا تھا۔ دراصل وہ دورِ جدید کا بانی اور تمام دنیا کا لیڈر ہے۔ وہ نہ صرف ان کا لیڈر ہے جو اسے لیڈر مانتے ہیں بلکہ وہ ان کا بھی لیڈر ہے جو اسے نہیں مانتے۔ ان کو اس امر کا احساس تک نہیں کہ جس کے خلاف وہ زبان کھولتے ہیں، اس کی رہنمائی کس طرح ان کے حالات میں، ان کے اصولِ حیات میں، تو انینِ عمل میں اور ان کے عصرِ جدید کی رُوح میں پیوست ہو گئی ہے۔"[2]

---

[1] Introduction to the History of Science, by Prof. Sarton

[2] مسیحی مصنف چارلس عیساوی اعتراف کرتا ہے کہ "یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ اگر کسی فردِ واحد نے تاریخ کا دھارا موڑا ہے تو وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں"۔ بحوالہ Charles Issavi The Muslim World Issue April 1950, page 90

۱۔ یہی شخص ہے جس نے دنیا کے تصوّرات کا رُخ وہمیت اور عجائب پرستی اور رہبانیت کی طرف سے ہٹا کر عقلیت اور حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیا کی طرف پھیر دیا۔

۲۔ اس نے محسوس معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انہی کو معیارِ صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔

۳۔ اس نے خرقِ عادت میں خدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور انھیں آثارِ فطرت Natural Phenomena میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا خوگر بنایا۔

۴۔ اسی نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو قیاس آرائی Speculation سے ہٹا کر تعقّل، اور تفکر، مشاہدہ اور تحقیق کے راستے پر لگایا۔

۵۔ اسی نے عقل اور حس اور وجدان کے امتیازی حدود انسان کو بتائے۔ مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی۔ دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل کا دین سے رابطہ قائم کیا۔ مذہب کی طاقت سے دنیا میں سائنٹیفک اسپرٹ اور سائنٹیفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔

۶۔ اسی نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا اور علم کی طاقت سے توحید کا اعتقاد اس مضبوطی سے قائم کیا کہ مشرکوں اور بت پرستوں کے مذہب بھی وحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

۷۔ اسی نے اخلاق اور روحانیت کے بنیادی تصورات کو بدلا۔ جو لوگ ترکِ دنیا اور نفس کشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے، جن کے نزدیک نفس اور جسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیوی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے کے ساتھ روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی۔ ان

کو اس نے تمدّن اور سماج اور دنیوی عمل کے اندر فضیلتِ اخلاق اور ارتقائے روحانی اور حصولِ نجات کا راستہ دکھایا۔

۸۔ پھر وہی ہے جس نے انسان کو اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان اور اوتار اور ابن اللہ کے سوا کسی کو ہادی اور رہنما تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، ان کو اس نے بتایا کہ انسان اور تمھارے ہی جیسا انسان آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور خداوند عالم کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔

۹۔ جو لوگ ہر طاقت ور انسان کو اپنا خدا بناتے تھے، ان کو اس نے سمجھایا کہ وہ بجز انسان کے اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص تقدس اور حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق لے کر آیا ہے، اور نہ کسی پر ناپاکی اور محکومیت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔

۱۰۔ اسی کی تعلیم نے دنیا میں وحدتِ انسانی اور مساوات اور جمہوریت اور آزادی کے تصوّرات پیدا کیے ہیں۔"[ل]

تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی کر ڈالیے۔ اسلام سے قبل اگر کسی مفکر نے یہ افکار پیش کیے ہوں تو ان کے نام سے اہلِ علم کو آگاہ کیا جائے اور اگر اسلام کے بعد کسی شخص نے یہ افکار پیش کیے ہیں تو ان سب پر اسلام کا پرتو پڑا ہوا ہے اور "اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّم" کے مصداق کامیابی کا سہرا عرب کے نبی اُمّی صلعم کے سر جاتا ہے۔

آج ان ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے
تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے
(آغا حشر کاشمیری)

ل "نبوتِ محمدی کا عقلی ثبوت" تفہیمات حصہ اول، از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۲۴۹

کتبِ استفادہ

۱۔ اسلام اور جدید مادی افکار ـــــ از محمد قطب
مترجم، سجاد احمد کاندھلوی

۲۔ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ـــ از محمد قطب مترجم محمد سلیم کیانی

۳۔ اسلام اور سائنس ـــــــ از ڈاکٹر محمد رفیع الدین
اقبال اکیڈمی کراچی

۴۔ اسلام اور نظریۂ ارتقا ـــــــ از احمد باشمیل
مترجم ساجد الرحمٰن صدیقی

۵۔ اسلام اور عصرِ رواں ـــــــ از ڈاکٹر غلام جیلانی برق

۶۔ اسلام کا فلسفۂ تاریخ ـــــــ از پروفیسر عبدالحمید صدیقی
مکتبہ چراغِ راہ کراچی

۷۔ اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریقہ کار از ڈاکٹر محمد رفیع الدین
دارالاشاعت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۴ء

۸۔ اخلاق اور ایمان ـــــــ از یوسف القرضاوی
مترجم پروفیسر عبدالحمید صدیقی

۹۔ افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید ـــــ از ڈاکٹر علامہ محمد اقبال
مترجم: چودھری نیاز احمد۔ لاہور

۱۰۔ اصولِ تعلیم ـــــــ از خواجہ غلام السیدین
ہندوستان اکیڈمی، الٰہ آباد

۱۱۔ الانتباہات المفیدہ عن العلوم الجدیدہ از مولانا اشرف علی تھانوی